

تفسیر سورۃ الفاتحۃ

فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ

اور

فضیلۃ الشیخ صالح بن فوزان الفوزان حفظہ اللہ

ترجمہ: طارق علی بروہی

توحیدِ خالص ڈاٹ کام

www.tawheedekhaalis.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اَپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیه ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

تفسیر سورۂ فاتحہ

فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ

(سابق سنئیر رکن کبار علماء کمیٹی، سعودی عرب)

فضیلۃ الشیخ صالح بن فوزان الفوزان حفظہ اللہ

(سنئیر رکن کبار علماء کمیٹی، سعودی عرب)

ترجمہ: طارق علی بروہی

Cover & Design

@ManzoorWaniJK (Twitter)

توحیدِ خالص ڈاٹ کام

www.tawheedekhaalis.com

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ

تعارف سورۃ الفاتحۃ

سورۂ فاتحہ کو ''الفاتحہ'' اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اسے کے ساتھ قرآن کا آغاز ہوتا ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ یہ سب سے پہلے نازل ہونے والی کامل سورت ہے۔۔۔

اس سورت کے بارے میں علماء کرام فرماتے ہیں: یہ مکمل قرآن کریم کے مجمل معانی کو شامل ہے جن میں توحید، احکام، جزاء اور بنی آدم کے اختیار کردہ راستوں وغیرہ کا ذکر ہے، اسی لیے اسے ''ام القرآن''[1] بھی کہا جاتا ہے، اور کسی بھی چیز کا اصل مرجع اس کی ماں کہلاتا ہے۔۔۔

اس سورت کے بہت سے امتیازات ہیں جن کی وجہ سے یہ دوسری سورتوں سے ممتاز ہے جن میں سے کچھ یہ ہیں:

---

[1] أخرجه البخاري في صحيحه ص61، كتاب الأذان، باب 104: القراءة في الفجر، حديث رقم 772؛ وأخرجه مسلم في صحيحه ص740 في كتاب الصلاة، باب 11: وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة، حديث رقم 878 [38] 395؛ وأخرجه الترمذي في جامعه ص1968، كتاب تفسير القرآن، باب 15: ومن سورة الحجر، حديث رقم 3124، ولفظه: "الحمد لله أم القرآن وأم الكتاب والسبع المثاني".

یہ نماز کا رکن ہے اور نماز ارکان اسلام میں سے شہادتین کے بعد سب سے افضل رکن ہے:

"لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ"[2]

(اس شخص کی نماز ہی نہیں جس نے اس میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی)۔

اور یہ رقیہ (دم) ہے۔ اگر اسے کسی مریض پر پڑھا جائے تو وہ اللہ کے حکم سے شفایاب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص سے جس نے بچھو کے ڈسے ایک شخص پر اسے پڑھ کر دم کیا تھا اسے فرمایا:

"وَمَا يُدْرِيكَ أَنَّهَا رُقْيَةٌ"[3]

(تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ دم ہے)۔۔۔

بعض لوگوں نے آج اس سورت کے تعلق سے ایک بدعت ایجاد کر دی ہے وہ یہ کہ اس کے ساتھ اپنی دعائوں کا اختتام کرتے ہیں، اس کے ساتھ خطبوں کا آغاز کرتے ہیں اور اسے بعض مخصوص مناسبات پر بھی پڑھا جاتا ہے۔۔۔ یہ غلط ہے۔ آپ کسی کو پائیں گے کہ وہ دعاء کرتا ہے

---

[2] صحیح بخاری 756، صحیح مسلم 395۔

[3] أخرجه البخاري في صحيحه ص177، كتاب الإجارة، باب 16: ما يعطى في الرقية على أحياء العرب بفاتحة الكتاب، حديث رقم 2276؛ وأخرجه مسلم في صحيحه ص1068، كتاب السلام، باب 23: جواز أخذ الأجرة على الرقية بالقرآن والأذكار، حديث رقم 5733 [65] 2201.

پھر جو اس کے ارد گرد ہوتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں اور اسے فاتحہ خوانی کا نام دیتے ہیں یعنی سورۃ فاتحہ پڑھو۔اور بعض لوگ اس سے خطبوں کا آغاز کرتے ہیں یا دیگر احوال کا تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ عبادات توقیف (وحیٔ الٰہی) اور اتباع پر مبنی ہوتی ہے۔۔۔

تفسیر سورۂ فاتحہ

القرآن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(اللہ کے نام سے جو رحمن ور حیم ہے)

تفسیر:

فرمان الٰہی ہے: ''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' میں جار اور مجرور متعلق ہیں محذوف کے اور اس محذوف کو فعل متأخر مناسب مقدر کیا گیا ہے۔یعنی اگر آپ ''بسم اللہ'' پڑھ کر کھانا کھانا چاہتے ہیں تو اس میں جو فعل مقدر مانا جائے گا وہ ''بسم اللہ آکل'' (میں اللہ کے نام سے کھاتا ہوں)۔۔۔

ہم نے کہا کہ واجب ہے کہ یہ جار مجرور کسی محذوف سے متعلق ہوں کیونکہ جار اور مجرور دونوں معمول ہیں اور ہر معمول کے لیے کسی عامل کا ہونا لازم ہے۔۔۔

اور اسے متأخر بھی دو فوائد کے سبب مقدر کیا گیا ہے:

پہلا فائدہ: اللہ عزوجل کے اسم سے تبرک کی بنا پر (تاکہ اس سے جملہ شروع ہو)۔

دوسرا فائدہ: حصر کا فائدہ۔ کیونکہ عامل کو متأخر لانا حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ گویا کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ میں کسی کے بھی نام سے تبرک لیتے ہوئے اور مدد چاہتے ہوئے نہیں کھاتا سوائے اللہ

تعالی کے۔

اور ہم نے اسے فعل اس لیے مقدر مانا کیونکہ عمل میں اصل افعال ہیں اور یہ بات اہل نحو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔اس لیے اسماء عمل نہیں کرتے جب تک کچھ شروط نہ ہوں۔

اور ہم نے اسے مناسب اس لیے مقدر مانا کیونکہ یہ مقصود پر زیادہ بہتر دلالت کرتا ہے۔اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"مَنْ لَمْ يَذْبَحْ فَلْيَذْبَحْ بِاسْمِ اللهِ"(4)

(جس کسی نے ذبح نہ کیا ہو تو وہ اللہ تعالی کا نام لے کر ذبح کرے)۔

یا فرمایا:

"عَلَى اسْمِ اللهِ"(5)

---

[4] أخرجه البخاري في صحيحه ص77، كتاب العيدين، باب 23: كلام الإمام والناس في خطبة العيد، حديث رقم 985؛ وأخرجه مسلم في صحيحه ص1027، كتاب الأضاحي، باب 1: وقتها، حديث رقم 5064 [1] 1960.

5أخرجه البخاري في صحيحه ص474، كتاب الذبائح والصيد، باب 17: قول النبي صلى الله عليه وسلم: "فليذبح على اسم الله"، حديث رقم 5500؛ وأخرجه مسلم في صحيحه ص1027، كتاب الأضاحي، باب 1: وقتها، حديث رقم 5064 [2] 1960.

(اللہ کے نام پر ذبح کرے)۔

پس یہاں فعل کو خاص فرمایا۔۔۔

اور ''اللہ'' رب العالمین کا ذاتی نام ہے جس سے کوئی اور موسوم نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے تمام اسماء اس کے تابع ہو کر ہی آتے ہیں۔

اور ''الرحمن'' کا معنی ہے وسیع رحمت والا۔ اسی لیے ''فعلان'' کے وزن پر آیا ہے جو کہ وسعت پر دلالت کرتا ہے۔۔۔

اور ''الرحیم'' کا معنی ہے اپنی رحمت کو اپنے بندوں میں سے جس تک چاہے پہنچا دیتا ہے۔ اسی لیے ''فعیل'' کے وزن پر آیا ہے جو کہ فعل کے وقوع پر دلالت کرتا ہے۔

پس ایک رحمت ہے جو کہ اس کی صفت ہے جس پر ''الرحمن'' دلالت کرتا ہے اور ایک رحمت اس کا فعل ہے یعنی مرحوم (جس پر رحم کیا جا رہا ہے) تک اپنی رحمت کو پہنچانا جس پر ''الرحیم'' دلالت کرتا ہے۔۔۔

اور ''الرحمن الرحیم'' اللہ تعالی کے اسماء میں سے دو اسم ہیں جو کہ اس کی ذات پر دلالت کرتے ہیں، ساتھ ہی صفت رحمت پر اور اس کے اثر یعنی اس کا حکم جس کی یہ صفت متقاضی ہے۔۔۔

اور وہ رحمت جسے اللہ تعالی نے اپنے لیے ثابت فرمایا ہے حقیقی رحمت ہے جس پر سمعی (وحیٔ الہی)اور عقلی دلائل دلالت کرتے ہیں۔ سمعی دلائل میں سے جو کچھ کتاب وسنت میں رحمت الہی کا اثبات آیا ہے، جو کہ بہت کثرت سے ہے۔ عقلی دلائل میں سے یہ ہے کہ جو بھی نعمت حاصل ہوتی ہے یا برائی دور ہوتی ہے تو وہ اللہ کی رحمت کے آثار میں سے ہے۔۔۔

اس حقیقت کے باوجود ایک فرقے نے اللہ تعالی کو حقیقی طور پر رحمت سے متصف کرنے کا انکار کیاہے۔ اوراس کی تحریف کرکے انعام یاارادۂ انعام سے تعبیر کیاہے۔اس زعم کی وجہ سے کہ عقل کے سامنے یہ بات محال ہے کہ اللہ تعالی کواس سے متصف کیا جائے کیونکہ وہ کہتے ہیں: رحمت تو جذبات کی رو میں بہنے، نرمی و خضوع اور رقت کا نام ہے، اور یہ اللہ تعالی کی شایان شان نہیں۔ان کارد دو صورتوں میں کیا جاسکتا ہے:

پہلی صورت: ضروری نہیں کہ رحمت میں خضوع،انکساری اور رقت ہو کیونکہ ہم دنیا میں بھی بہت سے طاقتور بادشاہوں کو پاتے ہیں کہ وہ رحم کرتے ہیں بنا کسی خضوع، رقت اور انکساری کو ظاہر کیے۔۔۔

دوسری صورت: اگر واقعی یہ باتیں رحمت کے لوازمات میں سے ہیں بھی تو یہ مخلوق کی رحمت کے لوازمات میں سے ہوں گے۔ لیکن جہاں تک خالق کی رحمت کا تعلق ہے تو وہ اس کی عظمت، جلالت وسلطنت کے شایان شان ہوں گی جس میں کسی بھی زاویے سے کسی بھی قسم کا

نقص نہیں پایا جائے گا۔۔۔

پھر ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ عقل اللہ تعالی کی حقیقی طور پر رحمت ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ ہم جو مخلوق کا آپس میں رحم کرنے کا مشاہدہ کرتے ہیں تو وہ رحمت الٰہی پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ رحمت ایک کمال ہے اور اللہ تعالی کمال صفات کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔ پھر ہم اس رحمت کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں جو اللہ تعالی کے ساتھ مخصوص ہیں جیسے بارش کا برسنا، خشک سالی کا ختم ہونا اور اس جیسے امور سب رحمت الٰہی پر دلالت کرتے ہیں۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالی کو حقیقی طور پر رحمت سے متصف کرنے کا انکار کرتے ہیں اس دلیل کے ساتھ کہ عقل اس پر دلالت نہیں کرتی یا اس کے نزدیک یہ محال ہے۔ یہی لوگ اللہ تعالی کے لیے حقیقی طور پر ارادے کی صفت کو ثابت کرتے ہیں ایسی عقلی دلیل کے ساتھ جو رحمت الٰہی کی عقلی دلیل سے بھی کمزور دلیل ہے۔ کہتے ہیں: بعض مخلوقات کی بعض خصوصیات کے ساتھ تخصیص کرنا جن کی وجہ سے وہ دوسری مخلوق سے متمیز ہے عقلی طور پر ارادۂ الٰہی پر دلالت کرتا ہے۔ بلاشبہ یہ بات صحیح ہے۔ لیکن یہ دلیل رحمت الٰہی کی عقلی دلیل کی نسبت زیادہ مخفی ہے کیونکہ ارادے کی دلیل جو بیان کی ہے اسے تو اہل ذہانت لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں مگر دوسری طرف رحمت الٰہی کے آثار تو عوام تک کو معلوم ہیں۔ کیونکہ اگر آپ کسی سادہ لوح عامی سے بھی بارش والی رات کے بعد صبح کو پوچھیں گے۔ بارش کیسے ہوئی؟ تو کہے گا: اللہ کے فضل اور رحمت سے برسی۔۔۔

مسئلہ: کیا بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے یا نہیں؟

اس بارے میں علماء کرام میں اختلاف ہے۔ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ یہ فاتحہ کی آیت ہے اور سے جہری نمازوں میں جہراً پڑھنا چاہیے۔ اور ان کے نزدیک بغیر بسملہ (بسم اللہ) کے قرأت صحیح نہیں۔ کیونکہ یہ فاتحہ کا حصہ ہے۔ اور ان میں سے بعض کہتے ہیں: یہ فاتحہ میں سے نہیں البتہ یہ قرآن کریم کی ایک مستقل آیت ضرور ہے۔ اور یہی دوسرا والا قول حق ہے۔ جس کی دلیل نص ہے اور اس سورت کا سیاق ہے۔۔۔

نص کی دلیل: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”قَالَ اللهُ تَعَالَى: قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ، وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ، فَإِذَا قَالَ الْعَبْدُ: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾، قَالَ اللهُ تَعَالَى: حَمِدَنِي عَبْدِي، وَإِذَا قَالَ: ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾، قَالَ اللهُ تَعَالَى: أَثْنَى عَلَيَّ عَبْدِي، وَإِذَا قَالَ: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾، قَالَ: مَجَّدَنِي عَبْدِي، فَإِذَا قَالَ: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾، قَالَ: هٰذَا بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي، وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ، فَإِذَا قَالَ: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ...إلخ﴾، قَالَ: هٰذَا لِعَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ“[6]

[6] أخرجه مسلم في صحيحه ص740، كتاب الصلاة، باب 11: وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة، حديث رقم 878 [38] 395.

(اللہ تعالی فرماتے ہیں: میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کردیا ہے۔ جب بندہ کہتا ہے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ''(تمام تعریفیں اللہ تعالی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے) تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔ جب وہ کہتا ہے: ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ''(جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے) تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری ثناء بیان کی۔ اور جب وہ کہتا ہے: ''مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ''(بدلے کے دن کا مالک ہے) تو اللہ تعالی فرماتا ہے: میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ جب وہ کہتا ہے ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ''(ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں) تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان نصف نصف ہے۔ اور جب وہ کہتا ہے: ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ...''(ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت دے۔۔۔اور آخر تک جو آیات ہیں)، تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: یہ میرے بندے کے لیے ہے، اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جس کا اس نے سوال کیا)۔

یہ گویا کہ ایک نص ہے اس بات پر کہ بسملہ فاتحہ کی آیت نہیں ہے۔ اور صحیح بخاری میں ہے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا:

''صَلَّيْتُ خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ وَأَبِي بَكْرٍ، وَعُمَرَ، وَعُثْمَانَ، فَكَانُوا يَسْتَفْتِحُونَ بِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، لَا يَذْكُرُونَ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ فِي أَوَّلِ قِرَاءَةٍ، وَلَا فِي

آخِرِهَا‘‘(7)

(میں نے نبی کریم ﷺ، سیدنا ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی تو یہ لوگ الحمد للہ رب العالمین سے قرأت شروع کرتے تھے لیکن بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں پڑھتے تھے نہ قرأت کے شروع میں اور نہ ہی آخر میں)۔

اس سے مراد ہے جہراً نہیں پڑھتے تھے لہذا فاتحہ اور بسملہ میں جہر اور عدم جہر کی صورت میں فرق کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ بسملہ فاتحہ کی آیت نہیں۔۔۔

اور سورت کے سیاق کو اگر معنی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو سورۂ فاتحہ کی بالاتفاق سات آیات ہیں۔ اگر آپ چاہیں کہ موضوع کے اعتبار سے سورت کی آیات کو تقسیم کریں تو ان کا نصف ’’اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ‘‘ بنتا ہے۔ اور یہ وہ آیت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا ہے۔ کیونکہ ’’اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ‘‘ پہلی آیت ہے، ’’الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ‘‘ دوسری، ’’مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ‘‘ تیسری، اور یہ سب کے سب اللہ تعالی کے حقوق ہیں۔ پھر ’’اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ‘‘ چوتھی یعنی وسط و درمیان میں ہے۔ پس یہ دو اقسام ہوئیں ایک قسم اللہ کا

---

[7] أخرجه مسلم في صحيحه ص741، كتاب الصلاة، باب 13، حجة من قال: لا يجهر بالبسملة، حديث رقم 892 [52] 399.

حق ہے اور دوسری قسم بندے کا حق ہے لہذا ''اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ'' (ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت دے) بندے کے لیے ہے، ''صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ'' (ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام فرمایا) بندے کے لیے ہے، ''غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ'' (ان لوگوں کی راہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ گمراہوں کی) یہ بھی بندے کے لیے ہے۔۔۔

پس تین آیات اللہ تعالی کا حق ہوئیں جو کہ پہلی تین آیات ہیں اور تین آیات بندے کا حق ہوئیں جو کہ آخری تین آیات ہیں۔ اور ایک بندے اور اس کے رب کے درمیان ہوئی اور وہ چوتھی یعنی درمیانی آیت ہے۔۔۔

پھر سورت کے سیاق کو اگر لفظ کے اعتبار سے دیکھا جائے: چناچہ اگر ہم کہتے ہیں کہ بسملہ فاتحہ کی آیت ہے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ ساتویں آیت اتنی طویل ہے جو دو آیات کے جتنی بنتی ہے۔ جبکہ یہ بات معلوم ہے ساتھ ساتھ آنے والی آیات کا طوالت اور اختصار میں یکساں ہونا ہی اصل ہے۔۔۔

پس صواب بات کہ جس میں کوئی شک نہیں یہی ہے کہ بسملہ فاتحہ کی آیت نہیں ہے۔ جیسا کہ بسملہ دیگر سورتوں کی بھی آیت نہیں ہے۔۔۔

القرآن

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾

(تمام تعریفیں اللہ تعالی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے)

تفسیر:

فرمان الٰہی: ''اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ'' میں ''اَلۡحَمۡدُ'' کا مطلب ہے محمود (جس کی تعریف کی جارہی ہے) اسے کمال کے ساتھ موصوف کرنا محبت اور تعظیم کرتے ہوئے۔ ہر قسم کا کمال خواہ ذاتی ہو وصفی ہو یا فعلی۔ کیونکہ وہ کامل ہے اپنی ذات میں، اپنی صفات میں اور اپنے افعال میں بھی۔ اور ''حمد'' کی تعریف میں محبت اور تعظیم کی قید لگانا ضروری ہے، کیونکہ اہل علم فرماتے ہیں: (مجرد کسی کو کمال سے موصوف کرنا بنا محبت اور تعظیم کے حمد نہیں کہلاتا بلکہ اسے صرف مدح کہتے ہیں)۔ اسی لیے انسان اس کی بھی مدح کرلیتا ہے جس سے وہ محبت نہیں کرتا کیونکہ وہ اس سے کوئی غرض رکھتا ہے کچھ چاہتا ہے۔ جیسے بعض شعراء امراء وحکمرانوں کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے عظیم ترین اوصاف بیان کرتے ہیں جن میں اس امیر کے لیے دلی محبت نہیں ہوتی بلکہ اس مال سے محبت ہوتی ہے جو وہ انہیں دیتا ہے، یا پھر اس کے خوف سے اس کی تعریف میں شعر پڑھتا ہے۔ لیکن ہماری حمد اپنے رب کے لیے محبت و تعظیم سے سرشار حمد ہوتی ہے۔ اسی لیے لازم ہے کہ ''حمد'' کی تعریف محبت اور تعظیم کی قید کے ساتھ کی جائے یعنی حمد کہتے ہیں جس کی تعریف کی جارہی ہے اسے کمال کے ساتھ موصوف کرنا محبت و تعظیم کرتے ہوئے۔ اور حمد میں ''ال'' استغراق کے لیے ہے یعنی ہر قسم کی

تعریفات۔۔۔

فرمان الٰہی: ’’لِلّٰهِ‘‘ میں ’’ل‘‘ اختصاص اور استحقاق کے لیے ہے۔ اور ’’اللہ‘‘ ہمارے رب عزوجل کا ایسا ذاتی اسم مبارک ہے جس سے کسی اور کو موسوم نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس کا معنی ہے ’’المألوہ‘‘ یعنی محبت و تعظیم کے ساتھ معبود (جس کی عبادت کی جائے، لو لگائی جائے)۔۔۔

فرمان الٰہی: ’’رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ‘‘ ’’الرب‘‘ وہ ہوتا ہے جس میں تین اوصاف جمع ہوں: خالق ہونا، مالک ہونا اور تدبیر کرنا۔ وہ ہر شے کا خالق ومالک ہے اور تمام امور کی تدبیر فرمانے والا ہے۔ اور ’’الْعٰلَمِيْنَ‘‘ کے بارے میں علماء کرام فرماتے ہیں جو کچھ بھی اللہ تعالی کے سوا ہے وہ عالم ہے۔ اور اسے عالم اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اپنے خالق سبحانہ وتعالی پر عَلَم (دلالت کرنے والی نشانی) ہوتے ہیں۔ پس مخلوقات اور ان کی ہر شے ان کے خالق پر دلالت کرتی ہے، اس کی قدرت، حکمت، رحمت، عزت اور جو دیگر ربوبیت کے معانی ہیں ان سب پر دلالت کرتی ہیں۔۔۔

فوائد:

1-اس آیت کے فوائد میں سے ہے اللہ تعالی کے لیے کامل حمد کا اثبات جو کہ الحمد میں موجود ’’ال‘‘ سے ثابت ہوتا ہے کیونکہ یہ استغراق پر دلالت کرتا ہے یعنی تمام کی تمام تعریفات۔۔۔

2-بے شک اللہ تعالیٰ ہی مستحق اور مختص ہے ہر زاویے سے کامل حمد کا، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بارے میں آیا ہے:

"إِذَا رَأَى مَا يُحِبُّ، قَالَ: الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي بِنِعْمَتِهِ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ، وَإِذَا رَأَى مَا يَكْرَهُهُ، قَالَ: الْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلَى كُلِّ حَالٍ"[8]

(جب کوئی خوشخبری ملتی تو فرماتے تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں کہ جس کی نعمت سے ہر قسم کے نیک امور انجام کو پہنچتے ہیں اور اگر اس کے برخلاف کوئی ناپسندیدہ بات دیکھتے تو فرماتے: ہر حال میں ہر قسم کی تعریفیں اللہ تعالیٰ کے ہی لیے ہیں)۔

3-اللہ کے الوہیت کے وصف کو ربوبیت کے وصف پر مقدم کیا گیا ہے۔اور یہ اس لیے کیونکہ یا تو "اللہ" اسم عَلَم ہے جو اس کے ساتھ خاص ہے اور دیگر تمام اسماء اس کے تابع ہو کر آتے ہیں۔ یا پھر جن لوگوں کی طرف رسول آیا کرتے تھے وہ صرف الوہیت کا ہی انکار کیا کرتے تھے۔۔۔

4-تمام جہانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا عموم کیونکہ فرمایا: "الْعٰلَمِيْنَ۔۔۔"۔

[8] صحیح ابن ماجہ 3081۔

القرآن

﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

(جو وسیع رحمت والا اور رحم فرمانے والا ہے)

تفسیر:

فرمانِ الٰہی: "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" میں "الرَّحْمٰنِ" لفظ جلالہ (اللہ) کی صفت ہے اور "الرَّحِيْمِ" دوسری صفت ہے۔ اور "الرَّحْمٰنِ" کا معنی ہے وسیع رحمت والا جبکہ "الرَّحِيْمِ" ایسی رحمت والا جو دوسروں تک اسے پہنچاتا ہے۔ پس "الرَّحْمٰنِ" اس کا وصف ہوا اور "الرَّحِيْمِ" اس کا فعل۔ اگر "الرَّحْمٰنِ" تنہا آتا یا پھر "الرَّحِيْمِ" تنہاء آتا تو وہ اکیلا ہی وصف اور فعل دونوں کو شامل ہوتا، لیکن جب یہ دونوں ساتھ ساتھ آئیں تو "الرَّحْمٰنِ" کی وصف سے اور "الرَّحِيْمِ" کی فعل سے تفسیر کی جاتی ہے۔۔۔

فوائد:

1-اللہ تعالی کے لیے "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" ان دو اسماء کریمہ کا اثبات، ساتھ ہی رحمت کے اس وصف اور فعل کا اثبات جو اس کو متضمن ہے۔۔۔

2-اللہ تعالی کی ربوبیت مخلوق تک پہنچنے والی وسیع رحمت پر مبنی ہے کیونکہ جب اللہ تعالی نے

فرمایا: ’’رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ‘‘ (تمام جہانوں کا رب ہے) تو گویا کہ سائل پوچھتا ہے کہ: یہ ربوبیت کس نوع کی ہے؟ کیا یہ پکڑ اور انتقام والی ربوبیت ہے یا رحمت وانعام والی ربوبیت ہے؟ تو فرمایا: ’’الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ‘‘ (جو وسیع رحمت والا اور رحم کرنے والا ہے)۔۔۔

القرآن

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾

(روز جزاء کا مالک ہے)

تفسیر:

فرمان الٰہی: "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" صفت ہے اللہ کی۔ اور "يَوْمِ الدِّيْنِ" قیامت کا دن ہے۔ اور یہاں "الدِّيْنِ" کا معنی ہے جزاء یعنی اللہ تعالیٰ اس دن کا مالک ہے جس میں مخلوقات کو جزاء دی جائے گی۔ اس دن اس کے سوا کوئی مالک نہیں ہوگا۔ اور "الدِّيْنِ" سے کبھی مراد جزاء ہوتی ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور کبھی اس سے مراد عمل ہوتا ہے جیسا کہ اس فرمان الٰہی میں ہے:

"لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" (الکافرون:6)

(تمہارے لیے تمہارا عمل اور میرے لیے میرا عمل)

یا جیسے کہا جاتا ہے: "کما تدین تدان" (جیسی کرنی ویسی بھرنی) یعنی جیسے عمل کروگے ویسی ہی جزاء ملے گی۔۔۔

اور فرمان الٰہی: "مٰلِكِ" (مالک) کی سبع قرأت ہے "مَلِكِ" (بادشاہ) اور "الملك" خاص

ہے "المالك" کی نسبت۔۔۔

اور ان دونوں قرأتوں کو جمع کرنے میں عظیم فائدہ ہے وہ یہ کہ اللہ تعالی کا ملک یا ملکیت حقیقی ہے، کیونکہ مخلوق میں سے بعض ملک (بادشاہ) بھی ہوتے ہیں لیکن مالک نہیں ہوتے بس نام کے بادشاہ ہوتے ہیں لیکن ان کی زیر تدبیر کوئی چیز نہیں ہوتی، جبکہ دوسری طرف بعض لوگ مالک ہوتے ہیں (کسی بھی چیز کے) لیکن ملک (بادشاہ) نہیں ہوتے جیسا کہ عام عوام ہوتے ہیں۔ لیکن رب عزوجل مالک بھی ہے اور ملک بھی۔۔۔

فوائد:

1-اللہ تعالی کے ملک کا اور روز جزاء اس کی ملوکیت (بادشاہت) کا اثبات، کیونکہ اس روز تمام ملوک (بادشاہ) اور ملوکیتیں (بادشاہتیں) مانند پڑ جائیں گی۔۔۔

اگر کوئی کہنے والا یہ کہے: کیا اللہ روز جزاء اور دنیا دونوں کا مالک نہیں؟

تو ہم جواب دیں گے: بالکل، لیکن اس کی بادشاہت، مالکیت اور سلطنت کا مکمل ظہور اس روز ہوگا۔ کیونکہ اس دن اللہ تعالی ندا فرمائے گا:

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾(غافر:16)

(آج کس کی بادشاہت ہے؟)

تو کوئی جواب نہ دے پائے گا۔ پھر خود اللہ تعالی فرمائیں گے:

﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾(غافر:16)

(واحد قاہر وغالب اللہ کی)

دنیا میں بادشاہ ہوتے ہیں بلکہ کچھ تو ایسے بھی ظاہر ہوتے ہیں جو اپنے معاشرے کا اپنے سوا کسی کو مالک ہی نہیں سمجھتے۔ جیسا کہ کمیونسٹ لوگ ہوتے ہیں وہ یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ آسمانوں اور زمین کا کوئی رب ہے۔ زندگی کے بارے میں ان کا تصور ہے کہ: رحم مادر بچے پیدا کرتی ہے اور زمین بوسیدہ ہڈیاں کھا جاتی ہے بس۔ اور ان کا رب ان کا رئیس یا صدر ہی ہوتا ہے۔۔۔

2- مرنے کے بعد جی اٹھنے اور جزاء کا اثبات، اس فرمان الٰہی سے کہ: "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ"۔

3- انسان کو اس بات پر ابھارنا کہ وہ اس دن کے لیے عمل کرے جس دن عمل کرنے والوں کو ان کے عمل کی جزاء دی جائے گی۔۔۔

القرآن

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾

(ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں)

تفسیر:

فرمان الٰہی: ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' میں ''اِيَّاكَ'' مفعول بہ مقدم ہے اور اس کا عامل ہے ''نَعْبُدُ'' اور اسے اپنے عامل پر مقدم اس لیے کیا گیا ہے تاکہ حصر کا فائدہ دے۔ پس اس کا معنی ہوا کہ: ہم کسی کی عبادت نہیں کرتے سوائے تیرے۔ اور اس جگہ وصل نہ ہونے کی عذر کی وجہ سے اسے منفصل بیان کیا گیا ہے۔ اور ''نَعْبُدُ'' (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) سے مراد ہے تیرے لیے تذلل اختیار کرتے ہیں اکمل ترین تذلل۔ اسی لیے آپ مومنین کو پاتے ہیں کہ وہ اپنے جسم کے اشرف ترین مقام کو قدموں کے مقام پر اللہ تعالی کے لیے تذلل اختیار کرتے ہوئے رکھتے ہیں یعنی مٹی پر سجدہ کرتے ہیں۔ اپنی پیشانی کو خاک آلود کرتے ہیں۔ یہ سب اللہ تعالی کے لیے ذلت اختیار کرنا ہے۔ اگر کوئی انسان کہے کہ: میں تمہیں ساری دنیا دینے کو تیار ہوں تم میرے لیے سجدہ کرو۔ تو ایک مومن کبھی بھی اس بات پر راضی نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ تذلل صرف اور صرف اللہ وحدہ کا حق ہے۔۔۔

اور ''عبادت'' (بندگی) ہر اس فعل کو متضمن ہے جس کے کرنے کا اللہ تعالی نے حکم دیا ہے اور جس کے کرنے سے اللہ تعالی نے منع فرمایا ہے۔ کیونکہ جو شخص اس طرح نہ ہو تو وہ عابد

نہیں کہلا سکتا۔ اگر یہ شخص وہ کام نہیں کرتا جس کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو حقیقی عابد نہیں، اسی طرح سے جس سے منع کیا گیا ہے اسے نہیں چھوڑتا تو بھی حقیقی عابد نہیں۔ ''عبد'' (بندہ) وہ ہے جو معبود کی شرعی مراد میں موافقت کرے۔ پس عبادت اس بات کو مستلزم ہے کہ انسان ہر اس کام کو کرے جس کا حکم دیا گیا ہے اور ہر اس کام کو چھوڑ دے جس سے منع کیا گیا ہے۔ اور یہ سب کرنا اس کے لیے بنا اللہ تعالی کی مدد کے ممکن نہیں۔ لہذا فرمایا: ''وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ'' (ہم تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں) یعنی ہم عبادت بجالانے وغیرہ کے لیے سوائے تیرے کسی سے مدد طلب نہیں کرتے۔ اور ''استعانت'' کا مطلب ہے معاونت طلب کرنا۔ اللہ تعالی نے عبادت اور استعانت یا توکل کو قرآن کریم کے بہت سے مقامات پر ساتھ جمع فرمایا ہے۔ کیونکہ عبادت کو اکمل صورت میں ادا کرنا سوائے معاونت الہی، امور کو اس کے سپرد کرنے اور اس پر توکل کرنے کے ممکن ہی نہیں۔۔۔

فوائد:

1- اللہ تعالی کے لیے عبادت میں اخلاص فرمان الہی ہے: ''إِيَّاكَ نَعْبُدُ'' اس میں اخلاص کا نکتہ معمول کی تقدیم کرنے سے حاصل ہوا۔۔۔

2- اللہ تعالی سے استعانت میں اخلاص فرمان الہی ہے: ''وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ'' کیونکہ اس میں مفعول کو مقدم کیا گیا۔۔۔

اگر کوئی کہنے والا کہے: اللہ تعالی سے استعانت میں اخلاص کس طرح سے کہا جاسکتا ہے خود قرآن کریم میں آیا ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾(المائدۃ:2)

(اور نیکی اور تقوی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو)

اور نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

"تُعِينُ الرَّجُلَ فِي دَابَّتِهِ فَتَحْمِلُهُ عَلَيْهَا، أَوْ تَرْفَعُ لَهُ عَلَيْهَا مَتَاعَهُ صَدَقَةٌ"[9]

(کسی شخص کو اس کی سواری کے تعلق سے مدد کرنا کہ اسے سواری پر چڑھنے میں مدد کرنا یا اس کا سامان اٹھا کر سواری پر رکھوا دینا بھی صدقہ ہے)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ: استعانت کی دو اقسام ہیں: استعانت تفویض یعنی آپ اللہ تعالی پر کلی اعتماد کریں اور اپنی کسی بھی قسم کی قوت وطاقت ہونے سے لاچارگی ظاہر کریں، یہ اللہ تعالی کے لیے خاص ہے۔ لیکن جہاں استعانت بمعنی مشارکت مراد ہو یعنی جو کچھ آپ کرنا چاہتے ہیں اس میں کسی کی مشارکت طلب کرنا تو یہ جائز ہے اگر جس سے مدد مانگی جارہی ہے وہ زندہ ہو اور مدد کرنے پر قادر ہو۔ کیونکہ یہ عبادت نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالی نے فرمایا: "وَتَعَاوَنُوا عَلَى

---

[9] أخرجه البخاري ص232، كتاب الجهاد، باب 72: فضل من حمل متاع صاحبه في السفرن حديث رقم 2891؛ وأخرجه مسلم ص837، كتاب الزكاة، باب 16: بيان أن اسم الصدقة يقع على كل نوع من المعروف، حديث رقم 2335 [56] 1009، واللفظ لمسلم.

الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى"(المائدۃ:2)۔

اگر کوئی کہنے والا کہے کہ: کیا مخلوق سے استعانت ہر حال میں جائز ہے؟

تو اس کا جواب ہے کہ: نہیں، استعانت مخلوق سے اسی صورت میں جائز ہے جب وہ اس پر قادر ہو۔ لیکن اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو اس سے استعانت طلب کرنا جائز نہیں۔ جیسے کوئی صاحب قبر سے استعانت طلب کرے تو یہ حرام ہی نہیں بلکہ شرک اکبر ہے۔ کیونکہ صاحب قبر اپنی ہی کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا تو تمہاری کہاں سے مدد کرے گا!!!۔ یا پھر جیسے کسی غائب کی مدد طلب کرنا جس پر وہ قادر ہی نہیں مثلاً یہ اعتقاد رکھنا کہ دنیا کے مشرق میں جو فلاں ولی ہے وہ اس کے ملک میں اس کے کام میں وہی رہتے ہوئے مدد کر سکتا ہے۔ یہ بھی شرک اکبر ہے کیونکہ وہ وہاں رہتے ہوئے اس کی مدد ہر گز نہیں کر سکتا۔۔۔

اگر کہنے والا کہے کہ: کیا مخلوق سے اس بات میں استعانت طلب کی جاسکتی ہے جس میں استعانت طلب کرنا جائز ہے؟

اس کا جواب ہے کہ: اولی تو یہی ہے کسی سے بھی استعانت طلب نہ کی جائے۔ الا یہ کہ کوئی ضروری حاجت ہو یا مدد کرنے والے کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ اس سے خوش ہوتا ہے۔ تو اس سے اس لیے مدد طلب کی جائے گی تاکہ وہ خوش ہو جائے۔ اور اس کے لیے ضروری ہے

کہ جس سے مدد طلب کی گئی ہو کہ (اگر کسی گناہ یا زیادتی کے کام میں مدد نہ مانگی گئی ہو) تو وہ ضرور مدد کرے۔۔۔

القرآن

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾
(ہمیں ہدایت دے صراط مستقیم کی)

تفسیر:

فرمان الٰہی ہے: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" اور "الصِّرَاطَ" کے متعلق بھی دو قرأت ہیں ایک "سین" کے ساتھ "السراط" اور ایک خالص "صاد" کے ساتھ "الصِّرَاطَ" اور "الصِّرَاطَ" کا مطلب ہے راستہ۔ اور ہدایت سے مراد ہدایت ارشاد اور ہدایت توفیق دونوں ہیں۔[10] دراصل آپ اپنے اس قول "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کے ذریعے اللہ تعالی سے علم نافع اور عمل صالح دونوں طلب کررہے ہیں۔ اور "الْمُسْتَقِيْمَ" یعنی جس میں کوئی ٹیڑھ پن نہیں۔۔۔

فوائد:

1- عبادت میں استعانت طلب کرنے کے بعد انسان کا اللہ تعالی کی جانب مزید التجاء کرنا کہ وہ اسے صراط مستقیم کی ہدایت دے۔ کیونکہ عبادت میں اخلاص کا ہونا ضروری ہے جس پر یہ

---

[10] ہدایت ارشاد کا معنی ہے ہدایت کی بات بتادینا جو انبیاء کرام اور ان کے متبعین کرتے ہیں جبکہ ہدایت توفیق یعنی ہدایت کی راہ پر چلادینا ہدایت دے دینا یہ اللہ تعالی کا کام ہے۔ (توحید خالص ڈاٹ کام)

فرمان الٰہی دلالت کرتا ہے کہ: ''اِیَّاکَ نَعۡبُدُ''اور استعانت سے عبادت میں قوت آجاتی ہے جس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے: ''وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ''اور اتباع شریعت سے بھی جس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے: ''اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ''کیونکہ ''الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ'' وہ شریعت ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ لے کر آئے۔

2-قرآن کی بلاغت کا اظہار کہ اس نے ''اِھۡدِنَا'' میں سے حرف جر کو محذوف کر دیا، جس کا فائدہ یہ ہوا کہ یہ دونوں اقسام کی ہدایت کی طلب کو متضمن ہے ہدایت علم اور ہدایت توفیق۔ کیونکہ ہدایت دو اقسام میں تقسیم ہوتی ہے۔ ہدایت علم وارشاد اور ہدایت توفیق و عمل۔ پہلی قسم میں سوائے دلالت کر دینے کے اور کچھ نہیں، اس معنی میں اللہ تعالی نے تمام مخلوق کو ہدایت دی ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ﴾(البقرۃ:185)

(رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے کہ جس میں قرآن کریم کا نزول ہوا جو لوگوں کے لیے سراسر ہدایت ہے)

اور دوسری قسم ہدایت کی اور اتباع شریعت کی توفیق ہے، جیسا کہ اللہ کے اس فرمان میں ہے:

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾(البقرۃ:2)

(یہ وہ کتاب ہے کہ جس میں کوئی شک نہیں، جس میں متقیوں کے لیے ہدایت ہے)

اور اس ہدایت سے بعض لوگ محروم رہتے ہیں جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾(فصلت:17)

(جہاں تک ثمود کا معاملہ ہے تو ہم نے انہیں ہدایت دی لیکن انہوں نے ہدایت پر اندھے پن کو ہی ترجیح دی)

"فَهَدَيْنٰهُمْ" یعنی ہم نے ان پر حق بات واضح کر دی، اور اس کی جانب رہنمائی کی مگر انہوں نے اس کی موافقت نہ کی۔۔۔

3- صراط دو اقسام میں تقسیم ہوتی ہے مستقیم (سیدھی) اور معوج (ٹیڑھی) جو حق کے موافق ہو وہ سیدھی و مستقیم راہ ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾(الانعام:153)

(اور یہ میری سیدھی راہ ہے تو اسی کی پیروی کرو)

اور جو حق کی مخالف ہو تو وہ ٹیڑھی راہ ہے۔۔۔

القرآن

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾

(ان لوگوں کی راہ پر جن پر تیرا انعام ہوا، ان لوگوں کی راہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ ہی گمراہوں کی)

تفسیر:

فرمان الٰہی: "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" عطف بیان ہے فرمان الٰہی: "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کا (یعنی صراط مستقیم ان لوگوں کی راہ ہے جن پر تیرا انعام ہوا) اور جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا وہ لوگ اس آیت میں مذکور ہیں فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ (النساء:69)

(اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی اور رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا، جیسے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین، اور یہ کیا ہی بہترین رفیق ہیں)

فرمان الٰہی: "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" اس سے مراد یہود ہیں اور جو بھی حق بات کا علم رکھتا

ہو مگر اس پر عمل نہ کرے۔۔۔

فرمان الٰہی: ''وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' اس سے مراد بعثت نبوی سے پہلے کے نصاری ہیں اور جو بھی بغیر حق و جہالت پر مبنی عمل کرے۔۔۔

اور فرمان الٰہی: ''عَلَيْهِمْ'' کے بارے میں سبع قرأت میں سے دو قرأتیں ہیں ایک میں ''ھا'' پر پیش ہے اور دوسری میں زیر ہے۔ یہ بات جاننی چاہیے کہ سبع قرأت میں سے عوام الناس کے سامنے ایسی قرأتیں نہیں کرنی چاہیے جو عام مصحف میں نہیں۔ مندرجہ ذیل تین وجوہات کی بناپر:

پہلی وجہ: عام عوام جن کے دل قرآن کریم کی تعظیم واحترام سے بھرپور ہیں اگر وہ اسے کبھی اس طرح پڑھتے ہوئے سنیں گے تو کبھی دوسری طرح سے تو اس کی قدر و منزلت کسی قدر ان کے دلوں میں کم ہو جائے گی کیونکہ وہ سادہ لوح عوام ہیں جو فرق نہیں کر سکتے۔۔۔
دوسری وجہ: قاری کو تہمت لگ جائے گی کہ اسے قرأت نہیں آتی کیونکہ وہ عوام کے سامنے وہ والی قرأت کر رہا ہے جو انہیں معلوم نہیں۔ پس یہ قاری لوگوں کی مجالس میں موضوع تنقید بن کر رہ جائے گا۔۔۔

تیسری وجہ: اگر کسی عام شخص کا اس قاری کے بارے میں حسن ظن ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ

جو پڑھ رہا ہے اس کے بارے میں اسے علم ہے تو ہو سکتا ہے وہ قرأت میں اس کی تقلید شروع کردے اور غلطی کر جائے۔ تو پھر وہ ایسی قرأت کرنے لگ جائے جو نہ عام مصحف والی ہو اور نہ ہی جو قاری نے کی تھی وہ والی۔ لہذا اس سے یہ مفسدہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔۔۔

اسی لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے فرمایا:

"حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُونَ، أَتُحِبُّونَ أَنْ يُكَذَّبَ اللهُ وَرَسُولُهُ"[11]

(لوگوں سے ان کی ذہنی سطح کے مطابق بات کیا کرو کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی جائے)۔

اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"إنك لا تحدث قوماً حديثاً لا تبلغه عقولهم إلا كان لبعضهم فتنة"[12]

(تم کوئی ایسی بات بیان نہیں کرتے کہ جو لوگوں کی ذہنی سطع سے بالاتر ہو مگر وہ بعض لوگوں کے لیے فتنے کا سبب بن جاتی ہے)۔

---

[11] أخرجه البخاري ص14، كتاب العلم، باب 49: من خص بالعلم قوماً دون قوم كراهية أن لا يفهموا، رقم 127.

[12] أخرجه مسلم ص675، مقدمة الكتاب، رقم 14. صحیح مسلم کے الفاظ ہیں: "مَا أَنْتَ بِمُحَدِّثٍ قَوْمًا حَدِيثًا، لَا تَبْلُغُهُ عُقُولُهُمْ، إِلَّا كَانَ لِبَعْضِهِمْ فِتْنَةً" (توحید خالص ڈاٹ کام)

اور جب سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا ہشام بن الحکم رضی اللہ عنہ کو اس طرح سے آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا جس طرح سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کبھی سنی نہیں تھی تو جھگڑتے ہوئے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ہشام رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ پڑھیں، جب انہوں نے پڑھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''هَكَذَا أُنْزِلَتْ'' (اسی طرح سے یہ نازل ہوئی ہے) پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم پڑھو، جب انہوں نے پڑھا تو اس پر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''هَكَذَا أُنْزِلَتْ''[13] (اس طرح بھی یہ نازل ہوئی ہے)۔

کیونکہ قرآن کریم سات قرأتوں میں نازل ہوا ہے اور لوگ مختلف قرأتوں کے مطابق تلاوت کیا کرتے تھے یہاں تک کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے جب لوگ آپس میں تنازع کرنے لگے اور آپ رضی اللہ عنہ کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں یہ اختلاف زور نہ پکڑ جائے تو سب کو ایک قرأت پر جمع فرمادیا۔ جو کہ قریش کی قرأت یا لہجے میں ہے کیونکہ نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن پر یہ قرآن عظیم نازل ہوا اسی قریش میں سے تھے۔ اور دیگر قرأتیں بھلادی گئیں۔ اگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جیسا شخص ایک صحابی کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے تو پھر آپ کا ایک سادہ لوح عامی کے بارے میں کیا خیال ہے جو آپ کو ایسی قرأت کرتے ہوئے سنے جسے وہ جانتا ہی نہیں! الحمد للہ، جب تک علماء

[13] أخرجه البخاري ص189، كتاب الخصومات، باب 4: كلام الخصوم بعضهم في بعض، حديث رقم 2419؛ وأخرجه مسلم ص805 – 806، كتاب صلاة المسافرين، كتاب فضائل القرآن وما يتعلق به، باب 48: بيان أن القرآن أنزل على سبعة أحرف وبيان معناها، حديث رقم 1899 [270] 818.

کرام متفق ہیں کہ کسی بھی انسان پر واجب نہیں کہ وہ تمام قرأتوں کے مطابق قرأت کرے اور اس کے لیے جائز ہے کہ کسی ایک قرأت پر اقتصار کرے تو فتنے اور اس کے اسباب سے بچنا ہی بہتر ہے۔۔۔

فوائد:

1-ان دو آیتوں کے فوائد میں سے ہے کہ ان میں اجمال کے بعد تفصیل بیان کی گئی ہے۔ کیونکہ فرمان الٰہی: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" (ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت دے) مجمل آیت ہے اور "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" اس کی تفصیل ہے۔ کیونکہ کسی چیز کو پہلے اجمالاً بیان کرکے پھر اس کی تفصیل کرنے میں فائدے ہیں:

پہلا فائدہ: کیونکہ نفس انسانی کے سامنے جب کوئی بات مجمل پیش کی جاتی ہے تو اس کے اندر اس کی تفصیل، بیان و وضاحت جاننے کا تجسس اور شوق پیدا ہوتا ہے۔ پھر جب اس کی تفصیل پیش کی جاتی ہے تو نفس اسے قبول کرنے کے لیے شوق کے ساتھ مستعد ہوتا ہے۔

دوسرا فائدہ: جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا وہ یقیناً صراط مستقیم پر ہیں۔۔۔

2-جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ان کے ہدایت پر ہونے کی نعمت کی نسبت اللہ وحدہ کی جانب کرنا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل محض ہے۔۔۔

3- لوگوں کی تین اقسام کا بیان: ایک وہ جن پر اللہ تعالی کا انعام ہوا، دوسری جن پر اللہ تعالی کا غضب ہوا اور تیسری قسم گمراہوں کی۔ اور ان اقسام کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔۔۔

اور صراط مستقیم سے خروج کے اسباب میں سے یا تو جہالت ہوتی ہے یا پھر عناد۔ جن کے خروج کا سبب عناد ہوتا ہے وہ مغضوب علیہم ہوتے ہیں جن میں سر فہرست یہود ہیں۔ اور دوسرے جن کے خروج کا سبب جہالت ہوتا ہے ہر وہ شخص جسے حق بات کا علم نہیں۔ جن میں سر فہرست نصاری ہیں۔ لیکن ان نصاری کا یہ حال بعثت نبوی سے قبل کا تھا۔ مگر بعثت کے بعد انہوں نے بھی حق جان لیا اور اس کی مخالفت کی۔ جس کی وجہ سے یہ اور یہود برابر ہو گئے۔ پس یہ سب اب مغضوب علیہم ہیں۔۔۔

4- قرآن کی بلاغت کا بیان کہ اس نے مغضوب علیہم (جن پر غضب ہوا) کو الضالین (گمراہوں) سے پہلے ذکر کیا، کیونکہ یہ لوگ حق کی مخالفت میں الضالین سے زیادہ شدید تر ہیں۔ کیونکہ علم رکھنے کے باوجود جو مخالفت کرے اس کا رجوع کرنا بہت مشکل ہوتا ہے برخلاف اس کے جو محض جہالت کی وجہ سے مخالفت کرے۔۔۔

بہر حال یہ ایک عظیم سورت ہے۔ اور میرے یا کسی اور کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کے تمام عظیم ترین معانی کا احاطہ کر سکے۔ لیکن یہ تو محض بحر عظیم میں سے ایک قطرہ تھا۔ جو اس بارے میں مزید وسیع مطالعہ کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "مدارج

السالکین''کا مطالعہ کرے۔۔۔

(تفسیر علامہ ابن عثیمین رحمۃ اللہ علیہ)

شیخ صالح بن فوزان الفوزان حفظہ اللہ

سورۂ فاتحہ کا مقام ومنزلت

اس سورۃ کا قرآن کریم میں عظیم مقام ہے۔ کیونکہ یہ اس میں عظیم ترین سورۃ ہے۔ جیسا کہ عظیم ترین آیت قرآن کریم میں آیۃ الکرسی ہے۔ اور اپنی اہمیت کے پیش نظر یہ مصحف میں سب سے پہلے لکھی ہوتی ہے اسی لیے اس کو فاتحۃ الکتاب بھی کہا جاتا ہے۔ پس یہ باتیں اس کی اہمیت ومنزلت پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ اسے سب پر مقدم رکھ کر سب سے پہلی سورۃ بنانا اس کی اہمیت کے سبب سے ہی ہے۔

نماز میں اس کی قرأت کا حکم

اس کی اہمیت کے سبب ہی اللہ تعالی نے اسے نماز کی ہر رکعت میں پڑھنا واجب قرار دیا ہے۔ جمہور علماء نماز میں اس کی قرأت کے وجوب کے قائل ہیں اور جو اسے نماز میں نہیں پڑھتا تو اس کی نماز صحیح نہیں۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ‘‘[14]

(اس شخص کی نماز نہیں جو فاتحۃ الکتاب نہیں پڑھتا)۔

---

[14] البخاری الاذان (723)، مسلم الصلاۃ (394)، الترمذی الصلاۃ (247)، النسائی الافتتاح (911)، ابوداود الصلاۃ (822)، ابن ماجہ اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا (837)، احمد (316/5)، الدارمی الصلاۃ (1242)۔

یہ حکم اس کے حق میں ہے جو اس کی قرأت کرنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ جبکہ جو عاجز ہے یعنی جو اس کی قرأت نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اسے حفظ نہیں کر سکا تو اس کو چاہیے کہ سورۂ فاتحہ کے علاوہ جو بھی قرآنی آیات یاد ہیں انہیں پڑھ لے۔ اور اگر اسے قرآن میں سے کچھ بھی نہیں آتا تو وہ ذکر کرے: سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ، اللہ اکبر اور لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''إِذَا قُمْتَ إِلَى الصَّلَاةِ فَكَبِّرْ، فَإِنْ كَانَ مَعَكَ قُرْآنٌ فَاقْرَأْ وَإِلَّا فَاحْمَدِ اللهَ وَكَبِّرْهُ وَهَلِّلْهُ ثُمَّ ارْكَعْ۔۔۔''[15]

(جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو تکبیر کہو۔ اگر قرآن میں سے کچھ یاد ہو تو وہ پڑھو ورنہ تحمید، تکبیر و تہلیل پڑھو پھر رکوع کرو۔۔۔)۔

اور جمہور علماء اس کی قرأت کے وجوب کی طرف گئے ہیں خواہ امام ہو یا منفرد البتہ مقتدی کے حق میں قرأت کے تعلق سے اختلاف ہے اور علماء کے اس بارے میں تین اقوال ہیں:

پہلا قول: یہ واجب ہے ہر نمازی پر خواہ امام ہو یا مقتدی یا پھر منفرد کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

---

[15] ابوداود الصلاۃ (856)، الترمذی الصلاۃ (302)۔

’’لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ‘‘[16]

اور یہ عام ہے ہر نماز کے لیے۔

اور فرمایا:

’’لَعَلَّكُمْ تَقْرَءُونَ خَلْفَ إِمَامِكُمْ؟! قَالُوا: نَعَمْ، يَا رَسُولَ اللهِ، قَالَ: لَا تَفْعَلُوا إِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَإِنَّهُ لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِهَا‘‘[17]

(شاید کے تم لوگ اپنے امام کے پیچھے قرأت کرتے ہو؟! کہا: جی، یارسول اللہ۔ فرمایا: ایسا نہ کرو سوائے فاتحۃ الکتاب کے کیونکہ اس شخص کی نماز ہی نہیں جو اسے نہیں پڑھتا)۔

اور یہ مذہب ہے امام شافعی اور محدثین کی ایک جماعت کا جیسے امام بخاری وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم وہ امام، مقتدی اور منفرد ہر ایک لیے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے وجوب کے قائل ہیں۔

دوسرا قول: یہ مقتدی پر واجب نہیں کیونکہ امام کی قرأت ہی کفایت کرتی ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

---

[16] حدیث گزر چکی ہے۔

[17] البخاری الاذان (823)، مسلم الصلاۃ (394)، الترمذی الصلاۃ (247)، النسائی الافتتاح (920)، ابوداود الصلاۃ (823)، ابن ماجہ اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا (837)، احمد (316/5)، الدارمی الصلاۃ (1242)۔

”مَنْ كَانَ لَهُ إِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْإِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ“[18]

(جس کا کوئی امام (نماز پڑھانے والا) ہو تو امام کی قرأت ہی اس (مقتدی) کی قرأت ہے)۔
لیکن اس حدیث کی سند میں مقال ہے۔

اور اللہ تعالی کے اس فرمان:

﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾(الاعراف: 204)

(اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور چپ رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے)

وہ اس آیت سے اس طور پر استدلال کرتے ہیں کہ قرآن کی تلاوت سننے اور خاموش رہنے کا حکم دیا ہے۔ اور یہ آیت نماز میں قرأت سننے کے تعلق سے نازل ہوئی ہے یعنی اگر امام قرأت کر رہا ہو تو مقتدی کے لیے ضروری ہے کہ وہ خاموش رہے اور قرأت کو سنے۔ پس یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ مقتدی کے ذمے قرأت نہیں کیونکہ امام اپنے لیے بھی اور مقتدیوں کی طرف سے بھی قرأت کرتا ہے۔ اور یہ قول امام ابو حنیفہ اور احمد رحمہما اللہ کا مذہب ہے۔

---

[18] ابن ماجہ اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا (850)، احمد (339/3)، اور یہ لفظ بیہقی نے اپنی سنن میں ذکر کیے ہیں: کتاب الصلاۃ باب (265) رقم (2989)، (228/2)۔

تیسرا قول: جو کہ امام مالک کا قول ہے جسے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور علماء رحمۃ اللہ علیہم کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے کہ سورۂ فاتحہ کی قرأت مقتدی پر صرف سری نمازوں میں واجب ہے جیسے ظہر وعصر، جبکہ جہری نمازوں میں امام کی قرأت ہی کفایت کرتی ہے۔ مقتدی کو چاہیے کہ وہ خاموش رہے اور سنے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اس طرح سے تمام دلائل میں جمع کی صورت بن جاتی ہے۔ پس جو دلائل سورۂ فاتحہ کی قرأت کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں وہ سری نمازوں سے متعلق ہیں۔ اور جو دیگر دلائل ہیں اور جو آیت بیان ہوئی وہ جہری نماز سے متعلق ہے۔ اور یہی قول سب اقوال میں معتدل ترین ہے ان شاءاللہ۔

سورۂ فاتحہ کے نام

اس سورۃ کے بہت سے نام ہیں۔ اور ہر نام ایک معنیٰ پر دلالت کرتا ہے۔ اور اگر کسی چیز کے کئی نام ہوں تو وہ اس کی فضیلت پر دلالت کرتے ہیں۔

پس اسے ''فاتحۃ الکتاب'' کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے ہی مصاحف کی کتابت کا آغاز ہوتا ہے۔

اور اسے ''ام القرآن'' بھی کہا جاتا ہے کیونکہ پورا قرآن انہی معانی کے گرد گردش کرتا ہے جو اس سورۃ میں بیان ہوئے ہیں۔ لہذا پورا قرآن جن معانی پر مشتمل ہے اور اس کی تفصیل آیات میں بیان کی ہے یہ سورۃ ان تمام معانی کو مجمل طور پر شامل ہے۔

اسے ''الرقیۃ'' (دم) بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے مریض پر دم کیا جاتا ہے۔ اس کی دلیل صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک گروہ کا گزر عرب کے کسی قبائل میں سے کسی قبیلے سے ہوا جنہوں نے صحابہ کرام کی مہمان نوازی سے انکار کر دیا پھر اسی قبیلے کے بڑے کو سانپ یا بچھو نے ڈس لیا اور انہیں اس کا کوئی علاج نہ ملا تو وہ ان صحابہ کی طرف آئے اور ان سے کہا کوئی دم جھاڑ کرنے والا ہے۔ تو صحابہ نے کہا: تم لوگوں نے ہماری مہمان نوازی نہیں کی اب ہم دم جھاڑ نہیں کریں گے جب تک تم ہمیں اس کی اجرت نہ دو۔ انہوں نے چند بکریوں کی اجرت مقرر کی۔ پس ایک صحابی کھڑا ہوا اور اس نے اس پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کرنا شروع کیا تو وہ شخص ڈسے ہوئے سے ایسا کھڑا ہوا جیسے اس کی رسی کھل گئی ہو (یعنی بالکل چاک وچوبند)۔ پس صحابہ نے وہ بکریاں لے تو لیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت ملنے تک ان میں کوئی تصرف نہ کیا۔ چناچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور تمام قصہ سنایا۔

اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''وَمَا أَدْرَاكَ أَنَّهَا رُقْيَةٌ''

(تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ یہ رقیہ (دم) ہے)؟!

پھر فرمایا:

''اقْتَسِمُوا هَذِهِ الْغَنَمِ وَاضْرِبُوا لِي مَعَكُمْ بِسَهْمٍ''[19]

---

[19] البخاری الطب (5417)، مسلم السلام (2201)، الترمذی الطب (2063)، ابو داود البیوع (3418)، ابن ماجہ التجارات (2156)، احمد (10/3)۔

(ان بکریوں کو آپس میں تقسیم کر دو اور میرا بھی حصہ اس میں رکھو)۔

اور فرمایا:

’’إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللهِ‘‘[20]

(جس جس پر تم اجرت لیتے ہو اان میں سب سے زیادہ اجرت لیے جانے کی حقدار تو اللہ کی کتاب ہے)۔

اسے ’’الشافیۃ‘‘ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اللہ تعالی کے اذن سے امراض سے شفاء دیتی ہے۔ دل کو شفاء دیتی ہے، بدن کو شفاء دیتی ہے۔ دل کو شکوک، اوہام ووساوس سے اور بدن کو تکالیف سے شفاء دیتی ہے جیسا کہ بچھو کے ڈسے ہوئے کا واقعہ ابھی گزرا۔

اور اسے ’’السبع المثانی‘‘ بھی کہا جاتا ہے، فرمان الہی ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ﴾(الحجر: 87)

(اور یقیناً ہم نے آپ کو بار بار دھرائی جانے والی سات آیتیں اور بہت عظمت والا قرآن عطا کیا ہے)

20 البخاری الطب (5405)۔

اور سبع مثانی سے مراد سورۂ فاتحہ ہے کیونکہ یہ سات آیات پر مشتمل ہے اور ان سات آیت کی صفت ''مثانی'' بیان ہوئی کیونکہ ہر رکعت میں اس کی قرأت کی تکرار کی جاتی ہے۔ اور اس کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِي، وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ الَّذِي أُوتِيتُهُ''[21]

(یہ سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو میں دیا گیا ہوں)۔

اسے ''الصلاۃ'' بھی کہا گیا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ حدیث قدسی بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں:

''قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ''[22]

(میں نے نماز اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دی ہے)۔

پھر آگے ''الصلاۃ'' کی تفسیر سورۂ فاتحہ سے فرمائی۔

تعدادِ آیات

اس سورۃ کی قرآن کی نص کے مطابق سات آیات ہیں جیسا کہ فرمان الہی گزرا:

---

[21] البخاری تفسیر القرآن (4204)، النسائی الافتتاح (913)، ابوداود الصلاۃ (1458)، ابن ماجہ الادب (3785)، احمد (211/4)، الدارمی الصلاۃ (1492)۔

[22] مسلم الصلاۃ (395)، الترمذی تفسیر القرآن (2953)، احمد (286/2)، مالک النداء للصلاۃ (189)۔

﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ﴾(الحجر:87)

(اور بلاشبہ یقیناہم نے تجھے بار بار دھرائی جانے والی سات آیتیں اور بہت عظمت والاقرآن عطا کیاہے)

پس فرمان الٰہی:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ یہ پہلی آیت ہے ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ یہ دوسری، ﴿مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ یہ تیسری، ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ یہ چوتھی، ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ یہ پانچویں،﴿صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ﴾ یہ چھٹی،﴿غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾اور یہ ساتویں۔

تعداد آیات کے متعلق یہ جمہور کا مذہب ہے۔ جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس طرف گئے ہیں کہ: ﴿صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾ پوری ایک آیت ہے۔اور یہ ساتویں آیت ہے۔ جبکہ سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ ہے۔

اسی وجہ سے مصاحف کی کتابت میں فرق ہوتاہے کہ بعض میں بسم اللہ کے بعد آیت نمبر 1 لکھا ہوتاہے جو اس جانب اشارہ ہوتاہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت ہے۔اور بعض میں یہ

موجود نہیں ہوتا اس قول کی پیروی میں کہ یہ سورۂ فاتحہ کی آیت نہیں ہے۔

پس بسم اللہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سورۂ فاتحہ کی آیت ہے۔ جبکہ جمہور کے نزدیک بسم اللہ نہ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے نہ ہی قرآن کی کسی اور سورۃ کی آیت ہے سوائے سورۂ نمل کے کہ یہ علماء کے اجماع کے مطابق اس سورۃ کی آیت کا ایک حصہ ہے، اس فرمان الٰہی میں:

﴿إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ (النمل:30)

(یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور یہ اللہ کے نام سے ہے، جو وسیع رحمت والا، اور رحم کرنے والا ہے)

البتہ اس کے علاوہ یہ ایک مستقل آیت تو ہے لیکن کسی معین سورۃ کی آیت نہیں۔ اسی لیے کسی بھی مصحف میں اس پر سورۃ کی آیت کا پہلا نمبر نہیں لکھا ہوتا سوائے سورۂ فاتحہ کے۔ کیونکہ یہ ایک مستقل آیت ہے جو مختلف سورتوں میں فاصلہ کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے۔ اسی لیے اسے ہر سورۃ کے شروع میں لایا جاتا ہے سوائے سورۂ براۃ (توبہ) کے، کیونکہ اس سورۃ کے شروع میں بسم اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل نہیں ہوئی جیسا کہ دیگر سورتوں میں نازل ہوئی۔ اس کی علت کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے: سورۂ توبہ دراصل سورۂ انفال کی تکمیل ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے: یہ تلوار و عذاب جیسے احکام کے ساتھ نازل ہوئی اور اس کے شروع میں ہی برائت وبیزاری کا اظہار کیا گیا ہے لہذا مناسب نہیں کہ اس کی ابتداء میں رحمت کا ذکر کیا جائے۔ واللہ اعلم۔

استعاذہ (اعوذ باللہ) اور بسملہ (بسم اللہ) کی شرح

﴿أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾

جہاں تک ﴿أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾ کا تعلق ہے تو یہ قطعہ سورۂ فاتحہ میں سے نہیں بلکہ اسے بطور استعاذہ (پناہ طلب) کرنے کے لایا گیا ہے، اس فرمان الہی پر عمل کرتے ہوئے کہ:

﴿فَاِذَا قرأت الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾(النحل:98)

(پس جب آپ قرآن پڑھیں تو مردود شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کیجئے)

جب کوئی مسلمان قرآن پڑھنے کا ارادہ کرے تو وہ اس قرأت کی ابتداء میں شیطان رجیم سے اللہ تعالی کی پناہ طلب کرے تاکہ وہ شیطان سے محفوظ ہو جائے کہ کہیں وہ اس قرأت کے دوران تشویش پیدا نہ کرسکے۔

اور ''أَعُوذُ'' کا معنی ہے میں اللہ تعالی کے حضور التجاء کرتا ہوں اور اس کے ذریعے اس دشمن سے بچاؤ اختیار کرتا ہوں۔ پس ''العوذ'' یعنی شیطان کے مقابلے میں اللہ تعالی کے حضور التجاءواس کی جانب لپکنا۔

اور ''الشیطان'' سے مراد ہے ہر دھتکارا ہوا خواہ وہ انس میں سے ہو یا جن یا کسی بھی جاندار میں

سے۔ کسی چیز کے بارے "شاط" ہو جانا یعنی شدت پیدا ہو جانا۔ یا پھر "شطن" سے ہے یعنی دفع دور ہو جانا۔ اسی لیے شیطان ہر خیر سے دور ہے۔

"الرجیم" فعیل بمعنی مفعول کے ہے یعنی المرجوم کیونکہ شیاطین کو آسمان سے شہاب ثاقب کے ذریعے رجم کیا جاتا ہے پس وہ کوئی بات اچک کر نہیں لے جا پاتے۔ اسی طرح سے ذکر الہی کے ذریعے بھی یہ رجم ہوتے ہیں۔ پس شیطان مرجوم ہے یعنی وہ خیر سے دور اور دھتکارا ہوا ہے۔ ایک مسلمان اپنے رب سے چمٹ جاتا ہے اور شیطان کے خلاف اسی سے التجاء کرتا ہے کہ کہیں وہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچادے، اور وہ اس کے ھمز، نفخ اور نفث سے بھی پناہ مانگتا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے ثابت شدہ استعاذہ اسی طرح سے وارد ہوا ہے[23]۔

اور "الھَمز" سے مراد ہے شیطان کا سوار ہو جانا ہے پس شیطان سوار ہو کر کبھی پاگل اور خبطی تک کر دیتا ہے۔ لہذا پاگل ہو جانا یہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے، فرمان الہی ہے:

﴿الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ﴾ (البقرۃ:275)

---

[23] جیسا کہ نماز میں استعاذہ سے متعلق حدیث میں سیدنا ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت آئی ہے اخرجہ احمد (11493)، (129/4)، ابو دواد: کتاب الصلاۃ، باب(122) رقم (344/1)، الترمذی: کتاب الصلاۃ، باب(65) رقم(242)، (9/2) اور اسی کی مانند ابن ماجہ میں سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (807) اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی (808)۔

(جسے شیطان نے چھو کر خبطی بنادیا ہو)

شیطان کے چڑھ جانے یا سوار ہو جانے سے مراد ہے کہ شیطان انسان کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور خون کی طرح اس میں دوڑتا ہے پس اگر اللہ تعالی اس سے اس کی حفاظت نہ کرے تو اسے کبھی کبھی دورے پڑتے ہیں اور شیطان اسے وساوس، اوہام اور دورے و جھٹکے پڑنے کے ساتھ تکلیف دیتا ہے۔

اور ''النَفْخ'' کا معنی ہے کبر و نخوت کیونکہ تکبر شیطان کی طرف سے ہے اور وہی اس تکبر کو انسان کے اندر پھونکتا ہے۔

''النَفْث'' یعنی شعر، فرمان الٰہی ہے:

﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ﴾ (الشعراء:224)

(اور شاعروں کے پیچھے تو گمراہ لوگ لگتے ہیں)

پس شعر بھی شیطان کی پھونک و تھتکارنے میں سے ہے الا یہ کہ کوئی اچھے شعر اور پاکیزہ شاعری ہو تو یہ ممدوح ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا، وَإِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حُكْمًا"[24]

(بعض بیان یقیناً سحر انگیز ہوتے ہیں،اور بعض اشعار پر حکمت ہوتے ہیں)۔

لیکن شعر کی غالب اکثریت برے شعر ہوتے ہیں اور یہ شیطان کی پھونک و تھتکارنے سے ہوتے ہیں۔اور یہ بھی کہا گیا کہ اس کے نفث سے مراد سحر (جادو) ہے۔فرمان الہی ہے:

﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ﴾(الفلق:4)

(اور گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے)

الاستعاذۃ نماز میں یا اس کے علاوہ قرأت سے پہلے پڑھنا مستحب ہے،کیونکہ فرمان الہی ہے:

﴿فَإِذَا قرأت الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾(النحل:98)

اور یہ حکم عام ہے جس میں نماز اور اس کے علاوہ قرأت داخل ہے۔

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

بسم اللہ میں "ب" استعانت کے لیے ہے۔اور اس میں فعل مقدر ہے۔جس کی تقدیر

[24] الترمذی الادب(2748)،ابوداود الادب(5011)،احمد(269/1)۔

ہے ''میں اللہ کے نام کے ساتھ استعانت طلب کرتا ہوں یا میں اللہ کے نام کے ساتھ پناہ طلب کرتا ہوں''۔ اور اسم ''اللہ'' مفرد مضاف ہے جو تمام اسماء الہی کو عام ہے۔ پس آپ کہتے ہیں کہ: میں پناہ میں آتا ہوں اور برکت حاصل کرتا ہوں اللہ تعالی کے اسماء کے ساتھ۔ کیونکہ اللہ تعالی کے اسماء بابرکت ہیں۔ فرمان الہی ہے:

﴿تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾ (الرحمن: 78)

(بہت برکت والا ہے تیرے رب کا نام جو بڑے جلال اور اکرام والا ہے)

اور نبی کریم ﷺ اپنے دعاء استفتاح میں فرمایا کرتے تھے:

''وَتَبَارَكَ اسْمُكَ''[25]

(اور تیرا نام برکت والا ہے)۔

پس اللہ تعالی کا اسم مبارک ہے اور آپ اس کے اسماء کے ذریعے تبرک حاصل کرتے ہیں۔ لہذا آپ کا یہ کہنا: ''بِسْمِ اللّٰهِ'' (اللہ کے نام سے) جار اور مجرور ہیں جو محذوف سے متعلق ہیں یعنی میں تبرک لیتا ہوں اور استعانت طلب کرتا ہوں اللہ کے اسم کے ساتھ۔

---

[25] الترمذی الصلاۃ (242)، النسائی الافتتاح (900)، ابوداود الصلاۃ (775)، ابن ماجہ اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا (804)، احمد (50/3)، الدارمی الصلاۃ (1239)۔

اور ''اللہ'' عَلَم ہے الالہ اور معبود برحق پر اور یہ اللہ تعالی کے اسماء میں سے سب سے عظیم نام ہے۔ اللہ کا معنی ہے معبود اور محبت و تعظیم کے ساتھ جس کی جانب لو لگائی جاتی ہے۔ جو کسی کی عبادت کرتا ہے ہر حاجت میں اسی سے لو لگاتا ہے اور اس کا اکیلا حقدار وہی اللہ معبود سبحانہ و تعالی ہے۔

''الرحمن'' اللہ تعالی کے اسماء میں سے ایک اسم (نام) ہے، جو کہ اس کی صفات میں سے ایک صفت کو متضمن ہے اور وہ ہے رحمت۔

''الرحیم'' بھی اللہ تعالی کے اسماء میں سے ہے۔ پس الرحمن اور الرحیم اس کے ناموں میں سے ہیں اور رحمت اس کی صفات میں سے ہے۔ اور اللہ تعالی کے ہر اسم میں اس کی صفات میں سے کوئی نہ کوئی صفت متضمن ہوتی ہے۔

الرحمن اور الرحیم میں فرق یہ ہے کہ الرحمن کا معنی ہے جس کی رحمت عام ہے تمام مخلوقات کے لیے۔ جبکہ الرحیم وہ مومنوں کے ساتھ خاص ہے، فرمان الہی ہے:

﴿وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا﴾ (الاحزاب: 43)

(اور اللہ تعالیٰ مومنوں پر بہت ہی مہربان ہے)

تفسیر آیات الفاتحہ

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾(الفاتحة: 1)

(ہر قسم کی حمد اللہ تعالی کے لیے ہے جو رب العالمین ہے)

"اَلْحَمْدُ" اللہ تعالی کی ثناء ہے۔ اللہ تعالی کی حمد بیان کی جاتی ہے یعنی اس کے اسماء وصفات وافعال کے ذریعے اس کی ثناء بیان کی جاتی ہے۔ اور حمد شکر سے زیادہ عام ہے۔ کیونکہ شکر صرف افعال پر ہوتا ہے جبکہ حمد اسماء وصفات اور افعال سب پر کی جاتی ہے، لہذا حمد شکر سے زیادہ عام ہے۔ پس یہ فرق ہے حمد اور شکر کے درمیان۔

اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" میں "ال" استغراق کے لیے ہے یعنی ہماقسم کے محامد وتعریفات ملکاً واستحقاقاً اسی کے لیے ہے۔

علی الاطلاق حمد کا مستحق اللہ تعالی کے سوا کوئی نہیں کیونکہ وہی انعام مطلق کرنے والا منعم حقیقی ہے۔ لہذا اسی کے لیے ہی حمد مطلق ہے سبحانہ وتعالی، پس فرمان الہی: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کا معنی ہے ہماقسم کے محامد وتعریفات صرف اللہ تعالی کے لیے ہیں۔

جبکہ مخلوق کی تعریف اس قدر ہی ہوتی ہے جتنا خیر اس سے صادر ہوتا ہے لیکن اللہ تعالی ہی نے اس میں یہ خیر رکھا ہے، لہذا اس میں بھی اصل حمد تو صرف اللہ تعالی ہی کے لیے ہے۔

"رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" رب وہ ہوتا ہے جو اپنی مخلوق کا اپنی نعمتوں کے ذریعے مربی ہو۔ وہ ان کا مالک ہے۔ الرب کا اطلاق مربی پر بھی ہوتا ہے اور اس کا اطلاق مالک اور مصلح پر بھی ہوتا ہے اور ان سے یہ سب مراد لی جاتی ہے کہ اللہ تعالی مربی بھی ہے، تمام مخلوقات کا مالک بھی ہے اور اپنے بندوں کے احوال کی اصلاح بھی کرتا ہے اور ان کا والی ہے۔

الرب کے لفظ کا اطلاق اللہ تعالی کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں۔ البتہ اس کا غیر اللہ پر اطلاق کرنے میں مضاف الیہ ہونا ضروری ہے (یعنی کسی چیز کی طرف اضافت کے ساتھ ہی بولا جائے)۔ پس یہ کہا جاتا ہے کہ: رب الدار، رب الابل یعنی اس کا صاحب ومالک۔ جبکہ الرب یا رب العالمین کا اطلاق صرف اللہ تعالی کے ساتھ خاص ہے کسی اور کو اس کے ساتھ موصوف کرنا جائز نہیں۔

اور "الْعٰلَمِيْنَ" جمع ہے عالم (جہان) کی اور اللہ تعالی کے سوا ہر چیز عالم ہے۔ اور کائنات میں بہت سے عالم ہیں، جنہیں اللہ تعالی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان میں سے عالم انس ہے، عالم جن، عالم ملائکہ، عالم جمادات، عالم حیوانات غرض مخلوق کی ہر جنس کو عالم کہا جاتا ہے۔ اور ان سب کا رب اللہ تعالی ہے ان میں سے کوئی بھی اس کی ربوبیت سے خارج نہیں۔

﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾(الفاتحة:2)

(وسیع رحمت والا، رحم کرنے والا)

ان کی تفسیر ہم نے بسم اللہ کی شرح میں جان لی ہے۔

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾(الفاتحة:3)

(بدلے و جزاء کے دن کا مالک)

اس میں دو قرأتیں ہیں ایک الف کے ساتھ "مالک" اور ایک "ملک" اور یہ دونوں صحیح ہیں۔ اللہ تعالی ہی مالک اور ملک (بادشاہ) ہے۔

"يَوْمِ الدِّيْنِ" یہاں الدین سے مراد حساب و جزاء ہے، فرمان الٰہی ہے:

﴿كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ﴾(الانفطار:9)

یعنی حساب و جزاء کو جھٹلاتے ہو۔

اور فرمایا:

﴿اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ﴾(الماعون:1)

یعنی وہ جزاء، حساب اور مر کر جی اٹھنے کو جھٹلاتا ہے۔

اور فرمایا:

﴿فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ﴾ (التین: 7) یعنی حساب اور بروز قیامت جزاء وبدلہ۔

پس ''يَوْمِ الدِّيْنِ'' روز قیامت ہے۔ اسے یوم الدین اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ روز جزاء وحساب ہے۔

اور یہ کیوں کہا کہ: ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' جبکہ اللہ تعالی یوم الدین کا اور اس کے علاوہ بھی ہر دن کا مالک ہے؟ یہاں یوم الدین کو بطور یاددہانی کے مخصوص کیا ہے کیونکہ اس روز اللہ تعالی کے علاوہ کسی کی دنیاوی بادشاہی تک نہ ہو گی، جیسا کہ فرمایا:

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ (غافر: 16)

(آج کس کی بادشاہی ہے؟)

چاہے بادشاہ ہوں یا عام لوگ اس دن سب برابر ہوں گے کسی کی بادشاہی نہیں ہو گی سوائے اللہ تعالی کے اسی لیے اپنے اس قول ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' کے ساتھ اسے مخصوص فرمایا ہے۔ اگر کوئی (محدود اختیار کے ساتھ) بادشاہ تھا بھی تو اس روز اسے بھی زائل کر دیا جائے گا۔

اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالی فرمائیں گے:

"أَنَا الْمَلِكُ أَيْنَ الْمُتَكَبِّرُونَ؟ أَيْنَ الْجَبَّارُونَ؟"[26]

(میں بادشاہ ہوں، کہاں ہیں متکبر لوگ؟ کہاں ہیں جبار لوگ؟)۔

اور یہ بات اللہ کے اس فرمان میں بھی ہے کہ:

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾(غافر:16)

(آج کس کی بادشاہی ہے؟ اللہ ہی کی جو واحد و قہار ہے)

اس روز تمام لوگ برابر ہوں گے چاہے بادشاہ ہوں یا غلام، فقیر ہوں یا امیر واشراف۔ کوئی بھی دوسرے سے ممتاز نہیں ہوگا سوائے عمل صالح کی بنا پر۔

---

[26] البخاری التوحید (6977)، مسلم صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار (2788)، ابن ماجہ الزھد (4275)، احمد (77/2)۔

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾(الفاتحۃ:4)

(ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے استعانت (مدد طلب) کرتے ہیں)

''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' یعنی ہم تجھے عبادت کے ساتھ خاص کرتے ہیں یہاں ''اِيَّاكَ'' کو اس لیے مقدم کیا گیا ہے تاکہ یہ اختصاص پر دلالت کرے اور یہ کہ اللہ تعالی کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ اور یہ حصر کے باب میں سے ہے کیونکہ معمول کو عامل پر مقدم کرنے سے حصر کا فائدہ ہوتا ہے۔ یعنی عبادت کا کوئی بھی مستحق نہیں سوائے تیرے۔

''وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' یعنی ہم تجھ سے اعانت طلب کرتے ہیں۔ اور استعانت عبادت ہی کی ایک قسم ہے پھر کیوں اسے الگ سے بیان کیا حالانکہ وہ پہلے ہی عبادت میں داخل ہے اس فرمان میں ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ''؟ کہتے ہیں کہ: یہ خاص پر عام کے عطف سے ہے۔ کیونکہ عبادت اللہ تعالی کا حق ہے اور استعانت طلب کرنا مخلوق کا حق ہے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالی سے مدد طلب کرتا ہے اور اس سے اپنی حاجتیں طلب کرتا ہے۔

اور یہاں ''اِيَّاكَ'' کو مکرر ذکر کیا تاکہ اختصاص کی تاکید ہو اور یہ نہیں کہا کہ ''اياك نعبد ونستعين'' اس لیے کہ کوئی بھی عبادت کا مستحق نہیں اور نہ ہی استعانت کا مستحق ہے سوائے اللہ تعالی کے۔ وہی مددگار ہے۔ اور پورا دین اسی عبادت واستعانت کے گرد گھومتا ہے۔ پورا

دین ان دو عظیم لفظوں کے گرد گھومتا ہے کہ: "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ"۔

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾(الفاتحۃ:5)

(ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت دے)

یہ دعاء ہے اور دعاء کی قسم دعاءِ مسألۃ میں سے ہے اور جو اس سورۃ کے شروع میں تھا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" تو وہ دعاء کی قسم دعاءِ عبادت میں سے تھا۔ کیونکہ دعاء دو قسموں میں تقسیم ہوتی ہے۔

دعاءعبادت: جو کہ اللہ تعالی کی حمد و ثناء ہوتی ہے پس اللہ تعالی کی تعریف بیان کرنا دعاء ہے جسے دعاءعبادت کہا جاتا ہے۔

دعاءِمسألۃ: (جس میں کسی چیز کا اللہ سے سوال کیا جاتا ہے) جس میں سے یہ فرمان الٰہی بھی ہے کہ: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے لے کر آخری سورۃ تک۔

"اِهْدِنَا" ہدایت یعنی دلالت وارشاد یعنی ہمیں دلالت فرما اور رہنمائی فرما۔

ہدایت کی چار قسمیں ہیں: لیکن اہم ترین دو اقسام ہیں:

پہلی قسم: ہدایت دلالت وارشاد۔ اور یہ دو جہتوں سے عام ہے۔ ایک ہدایت کے طور پر کہ یہ مومن وکافر دونوں کو حاصل ہے۔ اللہ تعالی کافروں کو بھی ہدایت دیتا ہے اس معنی میں کہ انہیں حق راہ کی جانب دلالت فرماتا ہے رہنمائی فرماتا ہے، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾(فصلت:17)

(اور جو ثمود تھے تو ہم نے انہیں سیدھا راستہ دکھایا مگر انہوں نے ہدایت کے مقابلہ میں اندھا رہنے کو پسند کیا)

یعنی ہم نے انہیں رہنمائی فرمائی۔ اور یہ ہادی و مرشد کی جہت سے بھی عام ہے جس میں رسول اور جس نے ان کی پیروی کی سب شامل ہیں:

﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾(الشوری:52)

(اور یقیناً آپ سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں)

دوسری قسم: ہدایت کی دوسری قسم حق بات قبول کرنے کی توفیق دینا ہے۔ اور یہ بھی دو جہتوں سے خاص ہے۔ یہ صرف مومن کو حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ اللہ تعالی کے خصائص میں سے ہے اسی لیے اللہ تعالی نے اس کی رسول اللہ ﷺ سے نفی فرمائی کہ:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾(القصص:56)
(بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جسے آپ محبوب رکھتے ہوں لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے)

اور یہ فرمان الٰہی کہ: ''اِهْدِنَا'' دونوں ہدایتوں کو عام ہے۔ ہدایت دلالت وارشاد اور ہدایت توفیق۔ یعنی ہمیں راہ دکھا اور رہنمائی فرما اور توفیق وثابت قدمی عطاء فرما۔

''الصِّرَاطَ'' لغوی اعتبار سے راستے اور راہ کو کہتے ہیں کہ جس پر انسان وحیوانات چلتے پھرتے ہیں۔ یہاں الصراط سے مراد اسلام، قرآن اور رسول ﷺ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو صراط اور طریق کہا جاتا ہے کیونکہ یہ سب اللہ تعالیٰ تک پہنچاتے ہیں۔

''الْمُسْتَقِيْمَ'' کا معنی ہے کہ جس میں کوئی ٹیڑھ پن وخفاء نہ ہو۔ مستقیم واضح ہو کہ جس پر چلنے والا گمراہ نہ ہو۔ برخلاف ٹیڑھے اور مختلف راستے کہ جو ان پر چلتا ہے تو گمراہ ہو جاتا ہے۔ لہذا فرمان الٰہی ہے:

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾(الانعام:153)

(اور یہ کہ بے شک یہی میرا راستہ ہے سیدھا، پس اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے جدا کر دیں گے۔ یہ ہے جس کا تاکیدی حکم اس نے تمھیں دیا ہے، تاکہ تم بچ جاؤ)

پس اللہ کی صراط تو واحد ہے جس میں کوئی تقسیم نہیں، نہ ٹیڑھ پن ہے نہ ہی خفاء۔ جبکہ ٹیڑھی صراط گمراہی کا راستہ ہے، العیاذ باللہ۔ لہذا جب نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ ---﴾ تو ایک سیدھی لکیر کھینچی اور اس کے ارد گرد بہت سے لکیریں کھینچیں۔ اور درمیانی سیدھی لکیر کے بارے میں فرمایا:

"هَذَا صِرَاطُ اللهِ"

(یہ اللہ کی راہ ہے)

اور دوسری لکیریوں کے بارے میں فرمایا:

"هَذِهِ سُبُلٌ عَلَى كُلِّ سَبِيلٍ مِنْهَا شَيْطَانٌ يَدْعُو إِلَيْهِ"[27]

(یہ مختلف راہیں ہیں جن میں سے ہر راہ پر شیطان بیٹھا اپنی طرف دعوت دے رہا ہے)۔

---

[27] البخاری الرقاق (6054)، الترمذی صفۃ القیامۃ والرقائق والورع (2454)، ابن ماجہ الزھد (4231)، احمد (435/1)، الدارمی المقدمہ (202)۔

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾(الفاتحۃ:6)

(ان لوگوں کی صراط جن پر تونے انعام فرمایا)

الصراط کواللہ تعالی کبھی اپنی طرف منسوب کرتے ہیں جیساکہ فرمایا:

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا﴾(الانعام:153)

یافرمایا:

﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ، صِرَاطِ اللّٰهِ﴾(الشوری:52)

(اور بلاشبہ آپ صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتے ہیں،اللہ کی صراط کی طرف)

اس میں اللہ تعالی ان صراط کی اضافت اپنی طرف فرمائی ہے۔کیونکہ اسی نے اسے شریعت بنایا ہے،اس کی جانب رہنمائی فرمائی ہےاور لوگوں کے لیےانہیں واضح فرمایاہے۔اوراس لیے بھی کیونکہ یہ وہ صراط وراستہ ہے جواللہ تعالی تک لے کر جاتاہےاس لیےاس کی اضافت اپنی طرف بطور شرف وتکریم کے فرمائی ہے۔ساتھ ہی اس بات پر دلالت کے لیےان کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے کہ یہ راہ مجھ تک پہنچاتی ہے۔

اور کبھی اس کی اضافت اس کے اہل کی جانب بھی کی جاتی ہے جیساکہ اس آیت میں ہے:

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾

ان کی جانب اضافت ہے جن پر اللہ تعالی کا انعام ہوا کیونکہ وہی اس راہ پر چلے ہیں بر خلاف اہل ضلالت و گمراہی کے کہ وہ گمراہی کے راستوں پر چلتے ہیں۔

"الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" ان پر تو نے انعام کیا کہ انہیں اس صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت و توفیق دی۔ اور یہ اللہ تعالی کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اور وہ کون ہیں جن پر اللہ تعالی نے انعام فرمایا ہے؟ اللہ تعالی نے اس کی بھی وضاحت اپنے اس فرمان میں فرمائی ہے:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ﴾(النساء: 69)

(اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، نبیوں اور صدیقوں اور شہداء اور صالحین میں سے)

پس اس صراط پر کون چلا ہے اور چلتا ہے؟ اس پر وہ چلتے ہیں جن پر اللہ تعالی نے انعام فرمایا: نبیوں میں سے یہ پہلی صنف ہے جو اس راستے پر چلے ہیں، اور صدیقین میں سے کیونکہ صدیقین انبیاء کے بعد سب سے افضل ترین مخلوق ہیں، اور فی سبیل اللہ شہداء میں سے جن کا

مرتبہ صدیقین کے بعد ہے، اور صالحین میں سے جو کہ تمام مومنین ہیں۔

جو اس راہ پر چلے ہیں اور چلتے ہیں ان کے طبقات ہیں: پہلا طبقہ ہر امت میں سے انبیاء کرام علیہم السلام کا ہے پھر اس کے بعد صدیقین، پھر شہداء اور پھر صالحین۔

اللہ تعالی سے دعاء ہے کہ وہ ہمیں اور آپ کو ان لوگوں کی مرافقت میں اس سبیل پر چلنے والا بنادے، آگے فرمایا:

﴿وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا﴾(النساء:69)

(اور یہ لوگ کیا ہی خوب رفیق ہیں)

جو انسان اس دنیا میں صراط مستقیم پر چلتا ہے تو اسے تنگیوں، مشکلات اور تکالیف کا سامنا ہوتا ہے۔ اور اسے لوگوں کے درمیان اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے اسے مار پیٹ، استہزاء، دھمکیوں اور تنقیص کا سامنا کرنا پڑے۔

جب اسے یہ یاد آتا ہے کہ اس کے رفقاء تو وہ ہیں جن پر اللہ تعالی نے انعام فرمایا نبیوں میں سے، صدیقین، شہداء اور صالحین میں سے تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور اس راہ پر چلنے کی صورت میں آنے والے ہر مصائب کا سامنا صبر سے کرتا ہے۔

اس راہ پر چلنا ناگوار باتوں، مشقتوں اور سختیوں سے بھرا ہوا ہے کوئی گلاب کی سیج نہیں۔ لہذا اس پر چلنے میں لازم ہے کہ طویل صبر کیا جائے اور عزم مصمم ہو۔ جو بات آپ کو اس راہ پر چلنے میں مددگار ثابت ہوگی اور اس راہ میں آنے والے مصائب کو ہلکا کرے گی وہ ان لوگوں کی رفاقت کو یاد کرنا ہے۔ لیکن اس کے لیے پختہ ایمان کی ضرورت ہے۔ بہت کم لوگوں کو اس کی توفیق میسر آتی ہے:

﴿وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ﴾(فصلت:35)

(اور یہ چیز نہیں دی جاتی مگر انہی کو جو صبر کریں اور یہ نہیں دی جاتی مگر اسی کو جو بہت بڑے نصیب والا ہے)

جن پر اللہ تعالی نے انعام فرمایا ہے وہ اہل علم نافع اور عمل صالح ہیں نبیوں میں سے، صدیقین، شہداء اور صالحین میں سے۔

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾(الفاتحة:7)

(مغضوب علیہم اور الضالین کا راستے پر نہ چلا)

"الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ "(جن پر غضب کیا گیا) کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے علم پر عمل نہیں کیا۔ علم نافع حاصل کیا اور سمجھ گئے لیکن اپنے علم پر عمل نہیں کیا۔ پس یہ مغضوب علیہم ہیں کیونکہ انہوں نے بصیرت کے ہوتے ہوئے اللہ تعالی کی نافرمانی کی۔ اور یہ ہر ایک کو

شامل ہے جو بھی اپنے علم پر عمل نہ کرے وہ مغضوب علیہم ہے۔ جن میں سے سر فہرست یہود ہیں کیونکہ یہود کے پاس علم تھا، اللہ تعالی نے انہیں اہل کتاب واہل علم کہا لیکن جب انہوں نے اپنے علم پر عمل نہیں کیا اللہ تعالی نے ان پر غضب فرمایا۔ مگر یہ ان کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر اس کے لیے ہے جو ان کے طریقے پر چلے یعنی علم حاصل کرے مگر اس پر عمل نہ کرے۔

"وَلَا الضَّآلِّيْنَ" (اور نہ گمراہوں کی) الضالین وہ ہیں جو بنا علم کے عمل کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہدایت پر نہیں ہوتے ان کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو کسی راہ پر چل رہا ہو مگر اسے راستہ معلوم نہ ہو۔ کیا جو شخص زمین پر چل رہا ہو مگر اسے راستہ معلوم نہ ہو اسے لغت میں ضال (گمراہ) نہیں کہا جاتا؟ اور یہ کہ وہ خطرے اور ہلاکت میں ہوتا ہے؟ پس جو بنا علم کے عمل کرے وہ شریعت میں گمراہ کہلاتا ہے، العیاذ باللہ۔ اگرچہ وہ عمل کرتا رہے، تھک ہار جائے، اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کرے، روئے چیخے، جنت کا طلبگار ہو لیکن جب تک اس کا طریقہ صحیح نہیں اسے کچھ نفع نہ ہوگا۔ اور الضالین میں نصاری داخل ہیں کیونکہ وہ بنا علم کے عمل کرتے تھے اور اس میں خرافی وبدعتی لوگ بھی داخل ہیں کیونکہ وہ بھی بنا علم کے عمل کرتے ہیں۔

پس ایک نمازی جو سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے تو وہ اللہ تعالی سے سوال کرتا ہے کہ وہ اسے ان دو اصناف کے طریقوں سے بچائے: جن کے پاس علم ہو اور وہ اس پر عمل نہ کریں، اور وہ جو بنا علم کے عمل کرتے ہیں۔

آج بعض جماعتیں پائی جاتی ہیں جو علم اور تعلم سے زہد (بے رغبتی) اختیار کرتی ہیں اور لوگوں کو کہتی ہیں کہ بس عبادت وذکر میں لگے رہو۔ اور فی سبیل اللہ (دعوت و تبلیغ کے لیے) نکلو۔ اور فی سبیل اللہ سے ان کی مراد گھر سے نکلنا، سفر کرنا اور مختلف علاقوں اور ملکوں میں گھومنا پھرنا ہوتا ہے۔ اور طلب علم سے زہد و بے رغبتی اختیار کرتے ہیں اور علم و اہل علم کی شان گراتے ہیں! یہ گمراہی کا طریقہ ہے، العیاذ باللہ۔ لازم ہے کہ سب سے پہلے علم ہو، کیونکہ فرمان الٰہی ہے:

﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ﴾ (محمد:19)

(پس اس بات کا علم حاصل کریں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں اور استغفار کریں)

پس قول و عمل سے پہلے یہاں علم سے شروع کیا گیا۔

سابقہ آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ علم و عمل کے تعلق سے لوگوں کی تین اصناف ہیں:

1- جنہوں نے علم نافع اور عمل صالح کو جمع کیا یہ وہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا۔ اس سورۃ میں ہم اللہ تعالیٰ سے جن کی راہ کی ہدایت اور اس پر چلنے کی دعاء کرتے ہیں وہ یہی لوگ ہیں۔

2- جنہوں نے علم لیا لیکن عمل چھوڑ دیا یہ مغضوب علیہم ہیں خواہ جس بھی ملت ودین سے ہوں۔

3- جنہوں نے صرف عمل لیا لیکن علم چھوڑ دیا یہ الضالون (گمراہ) ہیں۔ اور یہ دونوں فریق خسارے میں ہیں۔ اللہ تعالی سے ہی عافیت کا سوال ہے۔

اگر آپ اس سورۃ پر غور وتدبر کریں گے تو اس کی عظمت کا راز آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ اور اللہ تعالی نے اس کی اس منزلت وعظمت کے پیش نظر ہی دیگر سورتوں سے ہٹ کر اسے ہی نماز میں پڑھنا ضروری قرار دیا۔

ان وجوہات میں سے ایک یہ عظیم دعاء بھی ہے جس پر یہ سورۃ مشتمل ہے۔ سورۃ کے شروع میں دعاء عبادت اور آخر میں دعاءِ مسألۃ۔ پس یہ پوری دعاء ہے۔ اسی لیے مستحب ہے کہ نماز میں جب نمازی اس کی قرأت سے فارغ ہو تو آمین کہے (امام، مقتدی اور منفرد سب کے لیے یہ مستحب ہے)۔

اور آمین کا معنی ہے: اے اللہ قبول فرما۔ یعنی اس دعاء کو قبول فرما۔ اور یہ اس سورۃ میں وارد دعاء پر آمین ہے۔

اور آمین نماز میں واجب نہیں البتہ مستحب ہے کہ جہری نمازوں میں (جن میں باآواز بلند قرأت ہوتی ہے) بلند آواز میں آمین کہی جائے خواہ امام ہو، یا مقتدی و منفرد۔ لیکن اگر سری تلاوت ہو تو آمین بھی سراً (آہستہ آواز میں) کہی جائے۔

اس سورۃ کی فضیلت میں جو کچھ مروی ہے

اس سورۃ کی عظمت کے تعلق سے صحیح بخاری میں حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں:

’’قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ، وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ‘‘

(میں نے نماز اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف کردی ہے۔ اور میرے بندے کے لیے وہ کچھ ہے جس کا اس نے سوال کیا)۔

اور یہاں ’’الصلاۃ‘‘ (نماز) سے مراد سورۂ فاتحہ ہے۔ اسے الصلاۃ اس لیے کہا جاتا کیونکہ اسے نماز میں پڑھا جاتا ہے۔ اور اس لیے بھی کیونکہ الصلاۃ کا لغت میں معنی ہے دعاء کا اور سورۂ فاتحہ دعاء ہی ہے۔

یہ کہنا کہ: ’’بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ‘‘ (اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کردی ہے) پس یہ سات آیات ہیں۔ تین آیات اور نصف اللہ تعالی کے لیے اور باقی تین آیات اور نصف بندے کے لیے۔

"فَإِذَا قَالَ الْعَبْدُ: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾، قَالَ اللهُ تَعَالَى: حَمِدَنِي عَبْدِي، وَإِذَا قَالَ: ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾، قَالَ اللهُ تَعَالَى: أَثْنَى عَلَيَّ عَبْدِي، وَإِذَا قَالَ: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾، قَالَ: مَجَّدَنِي عَبْدِي، وَقَالَ: مَرَّةً فَوَّضَ إِلَيَّ عَبْدِي، فَإِذَا قَالَ: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾، قَالَ: هٰذَا بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي، وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ"۔[28]

(جب بندہ کہتا ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" (تمام تعریفیں اللہ تعالی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے) تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔ جب وہ کہتا ہے: "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" (جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے) تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری ثناء بیان کی۔ اور جب وہ کہتا ہے: "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" (بدلے کے دن کا مالک ہے) تو اللہ تعالی فرماتا ہے: میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ جب وہ کہتا ہے "إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں) تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے وہ کچھ ہے جس کا اس نے سوال کیا)۔

"إِيَّاكَ نَعْبُدُ" یہ اللہ تعالی کے لیے ہے، "وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" یہ بندے کے لیے ہے۔

---

28 مسلم الصلاۃ (395)، الترمذی تفسیر القرآن (2953)، احمد (286/2)، مالک النداء للصلاۃ (189)۔

پس اس فرمان الٰہی ”وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ“ سے لے کر آخر سورۃ تک بندے کے لیے ہے۔ کیونکہ بندے ان آیات کے ساتھ اپنے رب سے دعاء کرتے ہیں۔ اور اس فرمان ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ“ سے لے کر ”اِيَّاكَ نَعْبُدُ“ تک اللہ تعالی کے لیے ہے کیونکہ یہ سب اللہ تعالی کی حمد و ثناء ہے۔ پس یہ اس سورۃ کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ اسی لیے آگے فرمایا:

”فَإِذَا قَالَ: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ، صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾، قَالَ: هَذَا لِعَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ“[29]

(اور جب وہ کہتا ہے: ”اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ...“ (ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت دے۔ ان کی راہ جن پر تو نے انعام فرمایا، ان کی نہیں جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ ہی گمراہوں کی)، تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: یہ میرے بندے کے لیے ہے، اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جس کا اس نے سوال کیا)۔

اس سے مستنبط ہونے والے فوائد

علماء کرام فرماتے ہیں اس سورۃ سے متعلق جو بات اس کی عظمت پر دلالت کناں ہے وہ یہ ہے کہ اس سورۃ جلیل القدر معانی پنہاں ہیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

1- اس میں توحید کا اثبات ہے اپنی تینوں اقسام کے ساتھ۔ پس فرمان الٰہی: ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ

---

[29] اخرجہ مسلم من حدیث ابی ھریرۃ: کتاب الصلاۃ، باب (10)، رقم (395)، (324/2)۔

الْعٰلَمِیْنَ" یہ توحید ربوبیت ہے۔اور "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ" یہ توحید اسماء وصفات ہے،اور "اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" یہ توحید الوہیت ہے۔لہذا اس میں توحید کی تینوں اقسام کا ذکر ہے۔

2-اس میں رسالت کا اثبات ہے کیونکہ فرمان الٰہی: "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" میں اپنی تمام مخلوقات کے لیے اللہ تعالی کی ربوبیت کا اثبات ہے۔اور ربوبیت کا تقاضہ ہے کہ وہ بندوں کو ایسی چیز کے بغیر نہ چھوڑے جو ان کی اصلاح کرنے والی ہو اور وہ سب سے بڑی چیز جس سے بندوں کی اصلاح ہوتی ہے رسولوں کو بھیجنا ہے۔ اسی طرح سے فرمان الٰہی: "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" ہے کیونکہ رسولوں علیہم السلام کو بھیجے بغیر صراط مستقیم واضح نہیں ہوسکتی۔ پس اس میں رسالتوں کا اثبات ہے۔

3-اس میں گمراہ گروہوں کا رد ہے۔ چناچہ اس میں رد ہے ملاحدہ اور معطلہ کا کہ جو رب پر ایمان نہیں رکھتے کیونکہ اللہ کا یہ فرمانا: "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ملاحدہ پر رد ہے کہ جو یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اس عالم کا کوئی رب نہیں، بلکہ یہ خود ہی وجود میں آگیا ہے! اور فطرت وطبیعت سے یہ اشیاء خود ہی وجود میں آتی ہیں!! حالانکہ یہ بات تو عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ کسی بھی مخلوق کا وجود بنا خالق کے تصور نہیں کیا جاسکتا،اور نہ ہی کسی فعل کا بنا فاعل کے ہونا تصور کیا جاسکتا ہے۔ پس یہ پوری کائنات اور یہ تمام مخلوقات ایک خالق پر دلالت کرتی ہیں اور وہی ہے

کہ جو اسے وجود بخشا اور اس کی تدبیر فرماتا ہے، اس میں تصرف فرماتا ہے اور اس کا انتظام چلاتا ہے۔

اور اس میں رد ہے مشرکین پر کہ جو رب پر ایمان تو رکھتے ہیں لیکن اس کی عبادت میں غیروں کو شریک کرتے ہیں، اس فرمان الٰہی میں کہ: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" اور "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" اور "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" ان تمام آیتوں میں مشرکین پر رد ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ غیروں کی بھی عبادت کرتے ہیں۔

اس میں جہمیہ، معتزلہ اور منکرین صفات باری تعالیٰ پر بھی رد ہے۔

اور اس میں مر کر جی اٹھنے کا انکار کرنے والوں پر بھی رد ہے، اس فرمان الٰہی میں: "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" اور الدین سے یہاں مراد جزاء و حساب ہے پس اس میں مر کر جی اٹھنے کا اثبات ہے۔

اور اس میں یہود و نصاریٰ کا رد ہے اور جو کوئی ان کے طریقے پر چلے کہ جنھوں نے علم حاصل کیا مگر عمل نہیں کیا یا عمل لیا تو علم ترک کر دیا۔ پس اس میں رد ہے ہر اس عالم پر جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتا۔ اور ہر اس عمل کرنے والے پر رد ہے جو بنا علم کے عمل کرتا ہے۔ اسی لیے علماء فرماتے ہیں: یہ سورۃ تمام گروہوں کے رد پر مشتمل ہے۔ پس یہ اس بات کی مستحق ہے کہ یہ "ام الکتاب" کہلائے کیونکہ کسی چیز کی ام (ماں) وہ ہوتی ہے جس کی طرف وہ چیز رجوع کرتی

ہے پلٹتی ہے۔اور پورا قرآن اس سورۃ کی طرف لوٹتا ہے۔کیونکہ پورا قرآن انہی معانی کے گرد گردش کرتا ہے جن پر یہ سورۃ مشتمل ہے۔

الغرض یہ ایک عظیم سورۃ ہے بہت سے لوگ اسے پڑھتے ہیں اور محض زبان سے دہراتے رہتے ہیں۔ لیکن اس پر تدبر نہیں کرتے اور نہ ہی اس کے معانی کا کوئی فقہ و فہم رکھتے ہیں۔ بلکہ محض الفاظ ہوتے ہیں جو زبان پر جاری ہوتے ہیں جیسا کہ اعجمی کلام ہو!! اور یہ ایک بہت بڑی غلطی اور بہت بڑا خلل ہے۔ کیونکہ قرآن تو نازل ہی اس لیے ہوا ہے کہ اس پر تدبر کیا جائے تاکہ اس کے معانی کا فہم حاصل ہو۔ واللہ اعلم۔

(دروس من القرآن الکریم – الدرس الثانی)

سورۂ فاتحہ سے تقلید ثابت کرنے والوں کا رد

علمی تحقیقات اور افتاء کی مستقل کمیٹی، سعودی عرب

سوال: ایک شخص ہے پاکستان میں جس کا نام ہے محمد امین ہے، وہ یہ دعوی کرتا ہے کہ سورۂ فاتحہ صرف دو احکام پر مشتمل ہے۔ پہلا حکم تو شروع سے لے کر ﴿وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ تک ہے اور دوسرا حکم وہاں سے لے کر ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ تک ہے۔ پہلے حکم میں توحید کا بیان ہے۔ اور دوسرے میں تقلید کا اثبات ہے۔ پس کیا یہ تفسیر رسول اللہ ﷺ سے یا پھر تابعین

وتبع تابعین وغیرہ سے ثابت ہے، اور کس کتاب میں یہ تفسیر پائی جاتی ہے؟اور اگر دوسرا جزء تقلید کوثابت کرتاہے توکیارسول اللہ معاذاللہ مقلد تھے؟اورکیاقرآن کریم کی تفسیر قیاس سے کرنا جائزہے، اور اس شخص کا کیا حکم ہے جو قرآن مجید کی تفسیر اپنے رائے اور قیاس سے کرتا ہے، کیاوہ مسلمان ہے یاکافر؟اور وہ شخص اس تفسیر پر مصر ہے۔ ہم قرآن وسنت کی روشنی میں جواب کی امید کرتے ہیں۔ جزاکم اللہ خیراً؟

جواب: سورۂ فاتحہ بہت سے احکام پر مشتمل ہے۔ بلکہ قرآن مجید میں جتنے بھی احکام ہیں اجمالی طورپران تمام پر مشتمل ہے۔اسی لیے اسے ام القرآن کہا جاتاہے۔ نبی کریم ﷺ نے اسے یہ نام دیاہے جو خوداللہ تعالی نے بھی اسے نام دیایعنی قرآن عظیم۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں سیدنا ابو سعید بن المعلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا:

”مَرَّبِیَ النَّبِیُّ ﷺ وَأَنَا أُصَلِّی، فَدَعَانِی فَلَمْ آتِهِ حَتَّی صَلَّیْتُ، ثُمَّ أَتَیْتُ، فَقَالَ: مَا مَنَعَكَ أَنْ تَأْتِیَنِی؟ فَقُلْتُ: كُنْتُ أُصَلِّی، فَقَالَ: أَلَمْ یَقُلِ اللهُ: ﴿یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ﴾، ثُمَّ قَالَ: أَلَا أُعَلِّمُكَ أَعْظَمَ سُورَةٍ فِی الْقُرْآنِ، قَبْلَ أَنْ أَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ، فَذَهَبَ النَّبِیُّ ﷺ لِیَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ، فَذَكَّرْتُهُ، فَقَالَ: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ هِیَ السَّبْعُ الْمَثَانِی

وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ، الَّذِي أُوتِيتُهُ"[30]

(نبی کریم ﷺ میرے پاس سے گزرے جبکہ میں نماز پڑھ رہا تھا پس آپ ﷺ نے مجھے بلایا۔ لیکن میں آپ ﷺ کے پاس نہیں گیا جب تک نماز ختم نہ کی۔ پھر میں آپ ﷺ کے پاس گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہیں کس چیز نے میرے پاس آنے سے روکا تھا؟ میں نے عرض کی: میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اللہ تعالی نے یہ نہیں فرمایا: اے مومنو! لبیک کہو تم، اللہ اوراس کے رسول کی پکار پر، جب کہ وہ تمہیں بلائیں اس چیز کی طرف جس میں تمہاری زندگی ہے۔ پھر فرمایا: کیا میں تمہیں قرآن کریم کی سب سے عظیم سورۃ نہ بتلاؤں اس سے پہلے کہ تم اس مسجد سے باہر نکلو۔ پھر آپ ﷺ مسجد سے نکلنے کے لیے جانے لگے تو میں نے آپ ﷺ کو یاد دلایا(کہ آپ مجھے عظیم ترین سورۃ بتانے والے تھے)پس آپ ﷺ نے فرمایا: الحمدللہ رب العالمین (یعنی سورۂ فاتحہ) یہی وہ سبع مثانی (سات آیات جو بار بار دہرائی جاتی ہیں)اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطاء کیا گیا)۔

اسی طرح سے بخاری ہی نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

30 صحيح البخاري تفسير القرآن (4703) ، سنن النسائي الافتتاح (913) ، سنن أبو داود الصلاة (1458) ، سنن ابن ماجه الأدب (3785) ، مسند أحمد بن حنبل (211/4) ، سنن الدارمي الصلاة (1492).

''أُمُّ الْقُرْآنِ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ''[31]

(ام القرآن (یعنی فاتحہ) ہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے)۔

لیکن یہ احکام اپنی کثرت کے باوجود تین اقسام میں تقسیم ہوتے ہیں جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے۔

اول: جو اللہ تعالی کا حق محض ہے۔ جس پر شروع کی تین آیات مشتمل ہیں یعنی توحید ربوبیت اور اسماء وصفات پر۔

دوم: جو بندے کا حق محض ہے۔ جس پر یہ آیات: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ، صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ مشتمل ہیں۔

سوم: جو اللہ کے حق اور بندے کے حق دونوں پر مشتمل ہے۔ جو کہ یہ آیت ہے: ﴿إِيَّاكَ

[31] البخاري [فتح الباري] برقم (4704)، وأبو داود برقم (1457)، والترمذي برقم (3123).

نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾اور یہ دونوں توحید عبادت کہلاتے ہیں۔

اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو احمد، مسلم اور اصحاب سنن نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قَالَ اللهُ تَعَالَى: قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ، وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ، فَإِذَا قَالَ الْعَبْدُ: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾، قَالَ اللهُ تَعَالَى: حَمِدَنِي عَبْدِي، وَإِذَا قَالَ: ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾، قَالَ اللهُ تَعَالَى: أَثْنَى عَلَيَّ عَبْدِي، وَإِذَا قَالَ: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾، قَالَ: مَجَّدَنِي عَبْدِي، فَإِذَا قَالَ: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾، قَالَ: هٰذَا بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي، وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ، فَإِذَا قَالَ: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ...إلخ﴾، قَالَ: هٰذَا لِعَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ"(32)

(اللہ تعالی فرماتے ہیں: میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا ہے۔ جب بندہ کہتا ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" (تمام تعریفیں اللہ تعالی کے لیے

[32] أحمد (2 / 241، 242، 285، 460)، ومسلم برقم (395)، وأبو داود برقم (821)، والترمذي برقم (2953)، والنسائي (2 / 135)، وابن ماجه برقم (3846)، والدارقطني (1 / 312).

ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے) تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔ جب وہ کہتا ہے: "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" (جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے) تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری ثناء بیان کی۔ اور جب وہ کہتا ہے: "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" (بدلے کے دن کا مالک ہے) تو اللہ تعالی فرماتا ہے: میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ جب وہ کہتا ہے "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں) تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان نصف نصف ہے۔ اور جب وہ کہتا ہے: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ..." (ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت دے۔۔۔اور آخر تک جو آیات ہیں)، تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: یہ میرے بندے کے لیے ہے، اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جس کا اس نے سوال کیا)۔

اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ وہ اپنے اس قول میں صواب رائے پر ہے کہ سورۂ فاتحہ اول تا ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ توحید کے بارے میں ہے۔

ثانیاً: اس کا یہ دعوی کہ باقی سورۃ تقلید کو ثابت کرتی ہے صحیح نہیں۔ ہمارے علم کے مطابق یہ بات نہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور نہ ہی کسی صحابی یا تابعین رضی اللہ عنہم سے۔ بلکہ یہ قول کہ یہ آیات تقلید پر دلالت کرتی ہیں ان آیات کی حقیقی مراد سے تحریف کرنا ہے۔ اور اللہ تعالی کے ذمے بلا علم کے بات کرنا ہے۔ بلکہ ان آیات سے مراد یہ ہے کہ بندوں کو تعلیم دی جا رہی ہے

کہ کیسے اپنے رب سے دعاء کریں اور اس سے راہ حق اور صراط مستقیم کی رہنمائی طلب کریں۔ اور انہیں اس پر عقیدے، قول اور عمل کے اعتبار سے چلنے کی توفیق بھی دے۔ اور انہیں ان لوگوں کی راہ سے بچائے جن پر اللہ تعال کا غضب ہوا، اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق کو جانتے ہوئے بھی اس سے اعراض کیا جیسا کہ یہود۔ اور ان لوگوں کی راہ سے بھی بچائے کہ جو راہ حق سے ہی بھٹک گئے اور ان کی آنکھیں اندھی ہو گئیں کہ وہ اس راہ پر نہیں چلتے جیسے نصاری۔

لہذا اس سے واضح ہوا کہ ان آیات سے تقلید کے اثبات پر استدلال کرنا محض رائے سے تفسیر کرنے کے باب میں سے ہے اور اللہ تعالی پر بلا علم کے بات کرنے کے باب میں سے ہے جو کہ حرام ہے۔ اللہ تعالی نے فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (الاعراف:33)

(کہہ دیں میرے رب نے تو صرف بے حیائیوں کو حرام کیا ہے، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ اسے شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر وہ کہو جو تم نہیں جانتے)

وبالله التوفيق، وصلى الله على نبينا محمد وآله وصحبه وسلم .

اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء

عضو: عبد الله بن قعود عضو: عبد الله بن غديان نائب الرئيس: عبد الرزاق عفيفي الرئيس: عبد العزيز بن عبد الله بن باز

(مصدر: فتاوى اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء> المجموعة الأولى> المجلد الرابع (التفسير)> التفسير> تفسير سورة الفاتحة> اشتمال الفاتحة على أحكام كثيرة- فتوى رقم (5658)-)